کبھی درد بن کر اٹھوں گا میں دل میں
کبھی درد کو دل بنا کر رہوں گا

(نصیر کرمانی)

داستانِ حیات

میرا یہ ناول زندگی کی ایک داستان ہے وہ داستان جسے ہماری آنکھیں روز دیکھتی ہیں لیکن جسے ہمارے کان سننا نہیں چاہتے۔

ہندوستانی سماج کے مزاج، عادات و خصایل اور حالات و کوائف پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لکھا جا رہا ہے، لکھا جاتا رہے گا۔

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

سچ پوچھئے تو ہندوستانی سماج نے اب کتابِ دل اور خوابِ جوانی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ نئے نئے اسلوب کے ساتھ خامہ فرسائی کی جا سکتی ہے، یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیئے۔

میں نے اپنے ناول کا موضوع روشِ عام سے ذرا ہٹ کر منتخب کیا ہے۔ یہ ہے۔ سماج کی شہ رگ! میں نے شہ رگ پر حملہ کیا ہے۔ یہ حملہ بڑا خطرناک ہوتا ہے لیکن یہ خطرناک کام مجھ سے سرزد ہو ہی گیا۔

میں نے سماج پر قاتلانہ حملہ نہیں کیا ہے۔ ہاں اسے ضرب شدید پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس کے ان بے شمار جلووں میں سے چند کو بے نقاب کر دیا ہے جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:-

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں؟

رئیس احمد جعفری (ندوی)

باب ۱

اضطراب

برسات کا موسم تھا۔ رات کے ۱۲ بج چکے تھے۔ موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا۔ بادل کی گرج سے دل ہل جاتا تھا۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا، ابھی اور یہیں گری۔ رضیہ اپنے کمرے میں دو سال کے ایک ننھے بچے کو کلیجہ سے لگائے چپ چاپ پڑی تھی۔ اور کسی گہرے سوچ میں تھی۔ اس وقت ———

آج پچھلا زمانہ اسے یاد آرہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ آج سے تین برس پہلے کس چاؤ پیار سے میں یہاں دلہن بن کر آئی تھی۔ یہاں کی ہر چیز پر میری حکومت تھی۔ شاکر میرا تھا۔ میں اس کی تھی۔ کوئی غم ہو۔ کیسی ہی پریشانی ہو۔ لاکھ الجھنیں ہوں۔ ہم دونوں مل کر بیٹھے اور غم کافور تھا۔ قہقہے اور چہچہے شروع ہو گئے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کبھی کوئی پریشانی تھی۔ یہ اندیشہ بھی دل میں نہیں گذرتا تھا کہ ہم مبتلائے غم ہو سکتے ہیں۔

نوکر چاکر میرا ادب کرتے تھے۔ نند میرا لحاظ کرتی تھی۔ ساس کی نظر میں میری وقعت حد سے زیادہ تھی اور شاکر تو میرا درم ناخرید غلام تھا۔

عیش و کامرانی کے یہ دن کس قدر جلد بیت گئے۔ سال بھر بھی پورا نہ ہو پایا تھا کہ میں شاکر کی نظر سے اتر گئی۔ اس کی طبیعت مجھ سے سیر ہو گئی۔ وہ زہرہ کو چاہنے لگا۔ وہی چاوڑی بازار کی حور۔ میں اس عرصہ میں بدصورت نہیں ہو گئی تھی۔ مجھ میں کیڑے نہیں پڑ گئے تھے۔ میں اپنا سلیقہ اور سگھڑاپا نہیں بھول گئی تھی۔ میں وہی تھی۔ لیکن شاکر وہ نہیں تھا۔ اس کا دل بدل چکا تھا۔ کیوں ——— ؟ خدا جانے!

کیا زندگی مجھے اسی طرح سے گذارنی پڑے گی؟ کم بخت موت بھی تو نہیں آتی۔ جو مرنا چاہتے ہیں وہ زندہ رہتے ہیں۔ جو زندگی پر جان دیتے ہیں وہ فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ سچ پوچھو۔ تو میں خود بھی ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ میرے بعد عارف کا کیا حال ہوگا؟ اسے کون پالے گا؟ جب میرے سامنے کوئی اس کی بات نہیں پوچھتا۔ تو میرے بعد اس کی جو گت نہ بنے کم ہے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔

رضیہ ایک بڑے گھرانے کی لڑکی تھی۔ باپ بہت بڑے زمیندار تھے۔ شاکر بھی ایک بڑے زمیندار گھرانے کا فرد تھا۔ خوبصورت، شریف، مہذب، نستعلیق۔ رضیہ کے باپ نے اسے چھانٹا پرکھا اور رضیہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

شروع شروع میں تو رضیہ شاکر کی محبوبہ بنی رہی۔ بڑے پیار اور محبت سے رہتے تھے۔ یہ میاں بیوی نہ بے لطفی۔ نہ بدمزگی۔ نہ تلخی نہ بدگمانی۔ شکوہ۔ محبت کا ایک دریا تھا۔ جو بہا چلا جا رہا تھا۔ اور اپنے ساتھ ہر تلخی اور بدمزگی کو بہائے لئے چلا جا رہا تھا۔

پھر شاکر کی آمد و رفت زہرہ کے ہاں شروع ہو گئی۔ اور اس کے طور طریقے بدلنے لگے۔ پھر یہ ہوا۔ کہ وہ رفتہ رفتہ رضیہ سے بالکل بیگانہ اور زہرہ کا دیوانہ ہو گیا۔

یہ غم گھن کی طرح رضیہ کو کھائے جا رہا تھا۔ لیکن وہ چپ تھی اپنا سوز نہاں کسی پر حتیٰ کہ شاکر پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔

باب ۲

بھاوج اور دیور

شاکر جب تک رضیہ کا پرستار تھا سب ہی اس کا مان رکھتے تھے لیکن اس کی آنکھیں جیسے ہی پلیں، سارے گھر کی آنکھ پھر گئی۔ وہی گھر تھا۔ وہی رضیہ تھی لیکن پہلے وہ یہاں کی مالک و مختار تھی اور اب ناخواندہ مہمان!

شاکر کا چھوٹا بھائی منصور رضیہ کی بہت خاطر کرتا تھا۔ منصور حسن مردانہ کا جیتا جاگتا مرقع تھا۔ چست و چالاک، مضبوط اور تنومند، خوبرو اور دل کش! ایک روز اس کی شادی کا قصہ چھڑا، رضیہ نے کہا۔

"اب تو منصور تم شادی کرا ہی ڈالو۔"

"ڈھونڈ دو تم دلہن میرے لئے!"

کا "مکر تو نہ جاؤ گے؟"

چلا جابہ "ہرگز نہیں قول مرداں جان دارد!"

"اچھی بات! میں ٹوہ لگاؤں گی۔"

"لیکن ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میری بیوی بالکل......"

"پرستان کی پری ہو؟ یہی نا؟"

"نہیں!"

"آسمان کی حور ہو۔ کیوں؟"

"یہ بھی نہیں!"

"کوئی فلم ایکٹرس اس کا مقابلہ خوبصورتی میں نہ کر سکے۔"

"نا——!"

"اے واہ! پھر کیا ہو وہ؟"

"تمہارا نمونہ ہو۔ ہوبہو تمہارا نمونہ!"

"میرا نمونہ۔ ذرا ان کی سنو۔ مجھ میں کیا رکھا ہے؟"

"اس سے بحث نہیں۔ ویسی ہی بڑی بڑی آنکھیں ہوں جیسی تمہاری ہیں۔ ویسا ہی پیارا پیارا مکھڑا ہو۔ جیسا تمہارا ہے۔ وہی باتیں، وہی ادائیں، وہی صورت وہی سیرت بس بالکل تمہارا چربہ ہو۔ ایسی بیوی اگر ڈھونڈ سکتی ہو تو میرے لئے تو آج ہی سے تاک جھانک شروع کر دو۔ اور نہیں تو بندہ کو شادی ہی نہیں کرنی ہے!"

"اور اگر نہ ملی میری جیسی تو——؟"

"تو کیا۔ پھر شادی کون کرے گا؟"

"تم"!

"کہیں کی نہ ہو"۔

"دیکھیں گے"

"دیکھ لینا"

"اچھا ایک بات بتاؤ"

"پوچھو"!

"اُسے رکھو گے کس طرح"؟

"اپنے دل کی ملکہ بنا کر"

"سچ"!

"بالکل سچ"

"بالکل اپنے بھائی صاحب کی طرح"؟

منصور جھینپ سا گیا اور رضیہ بھی کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

باب ۳

سنسنی خیز

رضیہ اور منصور کی بے تکلفی بڑھتی جا رہی تھی۔ سارے گھر میں ایک منصور تھا۔ جس سے وہ ہنس بول لیتی تھی۔ سارے گھر میں ایک رضیہ تھی جس کا وہ سب سے زیادہ کہنا مانتا تھا۔

شام کو چار بجے حسب معمول کالج سے منصور آیا۔ کپڑے بدلے، ریکٹ ہاتھ میں لیا اور ٹینس کے ارادہ سے باہر جانے لگا۔ جاتے جاتے اس کی نظر رضیہ پر پڑی وہ اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ منصور نے کہا۔

"کیا پڑھا جا رہا ہے"؟

"ایک کتاب ہے"۔

"بڑی دلچسپ معلوم ہوتی ہے"؟

"ہوں"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"کیوں بتائیں!"

"ہم خود دیکھ لیں گے۔"

جھپٹا مار کر کتاب منصور نے رضیہ سے چھین لی اور وہ منہ دیکھتی رہ گئی۔ منصور نے کہا۔

"مان لی ہار؟"

"نہیں"

"تو کتاب نہیں ملے گی۔"

"کوئی زبردستی ہے۔ نہیں مانتے ہار۔"

"کوئی زبردستی ہے۔ نہیں دیتے کتاب۔"

"یہ چہلیں اپنی بیوی سے کرنا۔ لاؤ میری کتاب!"

"تم ہی بن جاؤ میری بیوی تھوڑی دیر کے لئے۔"

"بڑے بدتمیز ہو تم!"

"بدتمیز ہی۔ بھورا منی؟"

"بہت بڑھ رہے ہو تم منصور۔"

"کچھ بھی ہو۔ آج تو میں اپنے دل کی کتھا سنا کر رہوں گا۔"

"کیسی کتھا؟"

"یہ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"کچھ پاگل ہو گئے ہو تم۔"

"جو سمجھو۔"

"چلو ہٹو ایسی باتیں نہ کیا کرو مجھ سے۔"

"پھر کس سے کروں یہ باتیں؟ تم نہیں سنو گی تو سناؤں کس کے؟"

اب کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

"یہ باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی منصور؟"

"شرم کیوں آئے۔ میں کوئی جرم تو نہیں کر رہا ہوں۔ تمہارا اغوا تو نہیں کر رہا ہوں۔ تم سے کوئی ناجائز مطالبہ تو نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ کہو تو دنیا کے سامنے کہہ دوں۔"

"ہاں ہاں محبت آپ سے کی اور ضرور کی۔"

"محبت پر زور کس کا ہے۔ بس کس کا چلتا ہے۔ میں تم سے محبت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں بے بس ہو گیا اور مجھے محبت کرنی پڑی۔ تم چاہو تو مجھے ٹھکرا سکتی ہو۔ اسی طرح جیسے بھائی صاحب نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی میری محبت کم نہ ہوگی۔ بالکل اسی طرح جس طرح تم اب تک ان سے محبت کئے جا رہی ہو۔ جیسے تم اپنے دل سے مجبور ہو۔ ویسے ہی مجھے بھی مجبور سمجھو۔"

رضیہ نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ رونے لگی۔ منصور نے اسے روتے دیکھا تو کہا۔

"ہیں تم رونے لگیں۔ مت روؤ۔ اگر تمہیں میرے الفاظ سے تکلیف پہنچی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں حرفِ مدعا زبان پر نہ لاؤں تو تو میں کی

کوشش بھی کر دیکھونگا۔ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہاری محبت سے دست بردار ہو جاؤں تو بھی ہرگز اس کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ تمہاری محبت میری رگ رگ میں، نس نس میں بسی ہے تمہاری صورت میری آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے۔ تمہارا تخیل میرے دل و دماغ پر مسلط ہے۔ میں اپنے دل سے، اپنے دماغ سے، اپنی روح سے بغاوت نہیں کر سکتا۔

رضیہ اب بھی رو رہی تھی۔ منصور نے ریکٹ ایک طرف رکھ دیا۔ قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔

"میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟"

"کوئی ضرورت نہیں یقین دلانے کی۔"

"ہے"

"بالکل نہیں ہے"

"کیوں؟"

"تمہیں مجھ سے محبت کرنے کا حق نہیں ہے!"

"اس لئے کہ تم میرے بھائی کی بیوی ہو؟"

"ہاں کیا یہ معمولی وجہ ہے؟"

"بالکل معمولی۔ میں پوچھتا ہوں جو تم سے محبت نہیں کرتا تم اس پر جان کیوں دیتی ہو! جو تمہاری بات نہیں پوچھتا۔ تم کیوں اس کے نام کا وظیفہ پڑھتی ہو؟"

"تمہیں یہ پوچھنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔"

"تو میں سمجھ لوں کہ تم میری محبت ٹھکرا رہی ہو؟"

"یہ محبت نہیں ہے ہوس ہے اور واقعی میں اسے ٹھکراتی ہوں۔"

"ہوس ہے یہ؟"

"ہاں ہوس نری ہوس!"

"یہ کیسے فیصلہ کیا تم نے؟"

"یوں کہ اگر واقعی تمہیں محبت ہوتی۔ تو تم میرے عشق میں مر جاتے مگر یہ لفظ زبان پر نہ لاتے۔ اپنی خوشی کے لئے میری رسوائی نہ چاہتے۔ اپنے عیش کے لئے مجھے گمراہ کرنے کی کوشش نہ کرتے۔"

"میں تمہیں گمراہ کرنا چاہتا ہوں؟"

"یقیناً"

"کیونکر؟"

"تم جانتے ہو میں جوان ہوں سینہ میں دل اور دل میں آرزوؤں کا طوفان رکھتی ہوں۔ میرا شوہر مجھ سے بے تعلق ہو چکا ہے۔ عورت محبت کھو دینے کے بعد ڈانواڈول ہو جاتی ہے۔ وہ آسانی سے گمراہ کی جا سکتی ہے۔ ایسے وقت میں تم اپنی خوبصورتی پر ناز کرتے ہوئے میرے دل کے تاروں کو چھیڑتے ہوئے مجھے میری محبت کی ناکامی کا طعنہ دیتے ہوئے اور اپنے عشق کا نعرہ لگاتے ہوئے میرے سامنے آتے ہو بتاؤ اس کا مطلب اس کے سوائے کیا ہوا کہ میں خفیہ یا علانیہ شاکر کو چھوڑ دوں اور تمہاری ہو رہوں۔ اپنی دنیا بھی برباد کر لوں اور آخرت بھی۔"

"آخرت؟ یہ کیا چیز ہے؟"

"ہے ایک چیز جسے میں جانتی ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں کہ تم بھی اسے مانو۔"

"اب تو تم وعظ بھی بڑا اچھا کہنے لگیں۔"

"مذاق میں مت ٹالو۔ میں تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ اس طرح کی باتیں آئندہ تم مجھ سے نہ کرنا"۔

"ورنہ"؟

"ورنہ یہ کہ میں گھر بھر میں تمہیں ننگا کر دوں گی"۔

"اس کی پروا کسے ہے؟ میں تو خود اس سلسلہ میں بھائی صاحب سے گفتگو کرنے والا ہوں"۔

"کیا گفتگو کرو گے تم"؟

"یہ کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ وہ نہیں چاہتے۔ لہٰذا وہ طلاق دے دیں۔ میں شادی کر لوں"۔

"تمہیں آج ہو کیا گیا ہے منصور"؟

"کچھ نہیں"!

"پھر یہ بہکی بہکی باتیں کیوں"؟

"بہکی بہکی یا کھری کھری"؟

"تم شرم، غیرت، انسانیت ہر چیز کو بیچ چکے ہو"۔

"ہی ہی"!

"جب تم اپنے بھائی سے یہ باتیں کرو گے تمہاری زبان چلے گی"؟

"فرفر"

"تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں میری تائید حاصل ہے"؟

"میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے تمہاری تائید حاصل ہونی چاہئے"۔

"کیوں"؟

"اس لئے کہ میں تمہیں خوش رکھ سکتا ہوں اور بھائی صاحب نے تمہاری زندگی اجیرن بنا دی ہے"۔

"تمہیں میری زندگی کی اتنی فکر کیوں ہے"؟

"محبت جو ہے"۔

"لیکن میں تم سے محبت نہیں کرتی"۔

"نفرت کرتی ہو"؟

"ہاں"!

"تو اور اچھی بات ہے۔ محبت میں جب تک تلخی نہ شامل ہو اس کا لطف ادھورا رہتا ہے"۔

"پھر اگر میں تمہارے بھائی سے محبت کرتی ہوں تو کیوں اعتراض کرتے ہو تم"؟

"اس لئے کہ....."

"ہاں ہاں کہو کس لئے"؟

"اس لئے کہ تم مجھ سے نفرت نہیں کرتی ہو"۔

"کیا کہا"؟

"تم مجھ سے نفرت نہیں کرتی ہو"۔

"کرتی ہوں"۔

"جھوٹ"!

"جھوٹے تم ہو"

"اور تم بھی"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ چلو ہٹو جاؤ یہاں سے!"

"میں تو نہیں جاؤنگا یہاں سے"

"کچھ زبردستی ہے"

"یہی سہی!"

"کیوں نہیں جاؤگے؟"

"اقرارِ محبت کرا کے جاؤنگا"

"ہو چکا اقرار۔ چلو اپنی راہ لو"

"شکریہ اس اقرار کا۔ اب میں جاتا ہوں۔ تمہارے اس اقرار کا ذکر میں بھائی صاحب سے بھی کرونگا"

یہ کہہ کر منصور نے ریکیٹ اٹھایا اور باہر چلا گیا۔

باب ۴

طوفان

دوسرے دن صبح کو ناشتہ سے فارغ ہو کر شاکر باہر جانے کے ارادہ سے اچکن پہن رہا تھا کہ منصور پہنچا۔ شاکر نے اچکن کے بٹن لگاتے لگاتے بڑی شفقت سے پوچھا۔

"کچھ کام ہے؟"

"جی ہاں!"

"کہو"

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں"

(اس بیباکی پر قدرے متعجب ہو کر) "ضرور کرو!"

"لیکن بغیر آپ کے تعاون کے یہ ممکن نہیں"

(اور متحیر ہو کر) "میرا تعاون؟ تم سمجھتے ہو میں کوئی رکاوٹ ڈالونگا تمہاری

شادی میں ؟ بے وقوف کہیں کے"!

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے"!

"پھر کیا بات ہے"؟

"جب تک رضیہ کو طلاق نہ دے دیں میری شادی ہوگی کیسے"؟

(چہرہ سرخ ہوگیا۔ آنکھوں سے انگارے برسنے لگے) کیا کہا تونے؟

"آپ رضیہ کو طلاق دے دیجئے"!

"کیوں"؟

"آپ اس سے محبت نہیں کرتے۔ آپ کے لئے وہ بے کار ہے میں اس سے عشق کرتا ہوں میرے لئے وہ باکار ہے"!

"نالائق۔ بدمعاش۔ آوارہ۔ شیطان! دور ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے"!

"جی نہیں۔ مکان اور جائداد میں میرا بھی حصّہ ہے"!

"تو مجھ سے لڑنے آیا ہے"؟

"فیصلہ کرنے"!

"رضیہ کو طلاق دلوانے"؟

"جی ہاں"!

"تو چلا جا۔ خیریت اسی میں ہے دور ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے"۔

"کیا یہ گھر میرے باپ کا نہیں ہے؟ جتنا آپ کا حصّہ ہے اتنا ہی میرا ہے آپ ہی کیوں نہیں چلے جاتے یہاں سے"؟

"میں تجھے مار ڈالونگا۔ قتل کر دونگا"!

"اتنا کمزور تو میں نہیں ہوں کہ آپ مجھے مار ڈالیں اور میں مر جاؤں۔ آپ مجھے قتل کر دیں اور میں قتل ہو جاؤں۔ میں اپنی مدافعت کر سکتا ہوں اور کرونگا۔

"میں چھوڑے دیتا ہوں اس گھر کو آج سے یہاں قدم بھی نہیں رکھونگا۔

"لیکن جانے سے پہلے میرا اور رضیہ کا فیصلہ کرتے جایئے"!

"منصور! میں تیرا خون پی لونگا"!

"میں نہیں پینے دونگا۔ اتنی سکت ہے مجھ سے"!

یہ گرماگرم باتیں سُن کر اماں جان کمرہ میں تشریف لائیں انہوں نے پوچھا

"کیوں لڑ رہے ہو تم دونوں"؟

"دیکھ لیجئے لچھن اپنے چہیتے کے بیٹھے کیا فرما رہے ہیں صاحبزادے"؟

"توبہ! اری جلی کٹی باتیں۔ کچھ میں بھی تو سنوں"!

"حکم ہوتا ہے رضیہ کو طلاق دے دو"!

(بے انتہا حیرت زدہ ہو کر) کیا؟

"جی ہاں"!

"کیوں منصور"؟

"ٹھیک ہے اماں"!

"کیا کہہ رہا ہے تو"؟

"میں رضیہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بھائی صاحب سے کہتا ہوں کہ وہ طلاق دے دیں۔ لیکن وہ خفا ہو رہے ہیں"!

(انتہائی غصہ سے) "یہ کہتے ہوئے تیری زبان نہ کٹ گئی"؟

"کیوں کٹ جاتی میری زبان!"

"بڑے بھائی سے طلاق دلوا کر بھابی سے شادی رچائے کیوں"؟

"تو اس میں حرج کیا ہے"؟

"تجھے حرج نہیں ہے"؟

"بالکل نہیں ——— سیدھی سی بات ہے۔ بھائی صاحب رضیہ کو نہیں چاہتے۔ میں چاہتا ہوں، اسے پھر وہ کیوں خواہ مخواہ شوہر بنے رہیں، میری زندگی بھی خراب کریں اور اس کی زندگی بھی برباد کریں"۔

نالائق تو سمجھتا ہے۔ اگر شاکر طلاق دیدے تو رضیہ تجھ سے شادی کرلیگی۔ وہ ایسی شریف لڑکی ہے کہ تجھ پر تھوکنے کی بھی نہیں"۔

"جی نہیں! یہ آپ کا خیال ہے۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہیں"۔

(حیران ہو کر) "رضیہ تم سے محبت کرتی ہے"؟

"جی ہاں!"

"کیوں تہمت لگاتا ہے ایک شریف لڑکی پر"؟

"تہمت! خوب کہی یہ۔ بلوائیے انہیں۔ چلئے یہیں فیصلہ ہوا جاتا ہے"۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ سامنے سے رضیہ گذری شاکر نے آواز دی۔

"رضیہ یہاں آؤ"!

وہ آئی۔ اس نے دیکھا۔ عدالت تو جاری قائم ہے۔ شاکر کے چہرہ پر جلال برس رہا ہے۔ منصور چپ چاپ ہے اور بڑی بی جامہ سے باہر ہوئی جا رہی ہیں۔

وہ آکر کھڑی ہو گئی۔ شاکر نے بڑی گرج دار آواز میں پوچھا۔

"تم منصور سے شادی کرنا چاہتی ہو؟ تمہیں اس سے محبت ہے"؟

کون کہتا ہے؟

"میں" ——— منصور نے کہا۔

"بالکل جھوٹ"

"ڈر گئیں ان لوگوں سے؟ کہہ دو صاف صاف۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو ان سے طلاق لینا چاہتی ہو۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو"!

"تمہارے کہنے سے کہہ دوں؟ مجھے تم سے بالکل محبت نہیں ہے۔ میں ہرگز طلاق لینا نہیں چاہتی"۔

"یہ تمہاری کمزوری ہے اور میں جانتا ہوں عورت کمزور ہوتی ہے"!

اب شاکر سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ منصور پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا اماں جان بیچ میں آگئیں۔ انہوں نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔

"میرے لڑکے پر تو چلے پڑتے ہو۔ ذرا اپنی بیگم صاحبہ کی بھی تو خبر لو۔ وہ ٹھہرا لڑکا۔ یہ ٹھہریں ایک جہاندیدہ۔ انہوں نے ڈورے ڈالے وہ آگیا ان کے پھندے میں"۔

"اماں! تم بھی ایسی باتیں کہو گی"؟ رضیہ نے بڑی حسرت سے کہا۔

"بیٹا! میں تو کھری کہتی ہوں۔ جو جیسا کریگا۔ ویسا سُنیگا"۔

"میں نے ڈورے ڈالے"

"اور کیا وہ گیا تھا تمہارے پاس پیام دینے؟ جب دیکھو۔ جب آؤ منصور

شطرنج کھیلیں۔ چلو منصور چوسر کی ایک بازی ہو جائے۔ کیوں منصور وہ کتاب لائے ہماری؟ منصور یہ تو بتاؤ۔ وہ فلم کیسی ہے' وہ ایکٹرس کیسی ہے' ہم بھی دیکھیں گے وہ فلم! میری آنکھیں نہیں کہ میں دیکھتی نہیں کہ میرے کان نہیں کہ میں سنتی نہیں سب کچھ دیکھتی ہوں بیبی اپنی آنکھوں سے 'سب کچھ سنتی ہوں بانو اپنے کانوں سے میرے چپ رہنے سے یہ مطلب نہ نکالو کہ میں کچھ سمجھتی نہیں!"

رضیہ کے بیان سے شاکر کا چہرہ بحال ہو گیا تھا۔ ماں سے یہ روداد سن کر وہ پھر مشتعل ہو گیا۔

"اگر تم طلاق چاہتی ہو۔ میں ضرور تمہیں طلاق دے دونگا۔ لیکن یاد رکھو۔ منصور سے تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔"

"کیسی باتیں کر رہے آپ؟ میں کیوں طلاق چاہوں گی؟ میں کیوں کسی سے شادی کرنے لگی۔ آپ بھی ایسی باتیں کرنے لگے؟"

"دیکھو رضیہ کمزوری نہ دکھاؤ۔ کہہ دو صاف صاف یہی موقع ہے!"

"مجھے جو کچھ کہنا تھا صاف صاف کہہ چکی۔ نہ سمجھو تو تم پر خدا کی پھٹکار۔"

"زبان سنبھال لڑکی۔ پھٹکار خدا کی تجھ پر۔ تیرے ہوتوں سوتوں پہ چلی ہے شغل میرے لڑکے پر پھٹکار بھیجنے۔"

رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رونے لگی۔ شاکر غصہ میں باہر چلا گیا۔

باب ۵

پرانی دوستی نئی ملاقات

بہت دنوں سے رضیہ اپنے گھر نہیں گئی تھی جب سے وہ شاکر کی نظر سے اتری تھی اس کے تمام حوصلے پست ہو گئے تھے۔ پہلے وہ خوش خوش اپنے گھر پہنچتی تھی۔ سکھیوں اور سہیلیوں سے ملتی تھی۔ قہقہہ اور تبسم کی دنیا میں کھو جاتی تھی۔ اس لئے کہ اس کا سہاگ بنا ہوا تھا۔ لیکن اب اس کے ولولے سرد پڑ چکے تھے۔ ماں باپ کے تقاضے اور طلب کے باوجود وہ میکے جانے کا نام نہیں لیتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی افسردگی اور اداسی کا راز لوگوں کو معلوم ہو۔ اسی لئے وہ سسرال میں زندگی کے دن بسر کر رہی تھی۔

لیکن اب سسرال میں نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ شاکر کی سرد مہری تو وہ برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن منصور کے بے محابا عشق' بیباکانہ اعلان محبت' مجنونانہ مطالبہ طلاق اور بے پروایانہ تقاضائے شادی کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

وہ بھی اس حالت میں کہ ساس نے سارا الزام اسی کے سر تھوپ دیا تھا۔ اس کی نظر میں منصور معصوم تھا اور وہ گنہگار۔ گویا وہ منصور کو ورغلا رہی تھی۔ اس کا اغوا کر رہی تھی۔ یہ ستم وہ کس طرح سہے؟

اب سسرال میں وہ گھبرائی تھی۔ گھر اُسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ ہر چیز اس پر ہنستی ہوتی، اس کا مذاق اڑاتی ہوئی اس پر طنز و طعن کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ وہ گھر کی ماماؤں کا سامنے کرتے ہوئے شرماتی تھی۔ وہ گھر کے بچوں اور لڑکوں سے بات چیت کرتے ہوئے جھجکتی تھی۔ وہ ساس کو اپنا چہرہ دکھانے سے گریز کرتی تھی۔ وہ شوہر کے سامنے جاتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔ کیا منہ لے کر جائے، کس منہ سے سامنا کرے؟ یہ سب لوگ وہی تو ہیں جو اُسے زلیخا سمجھ رہے تھے اور منصور کو یوسف!

وہ بعض وقت سوچتی، کہیں سے زہر مل جائے تو کھا لوں۔ اس رسوائی سے تو نجات ملے۔ شاکر عمر بھر بات نہ کرتا، منہ نہ دیکھتا، توجہ نہ کرتا۔ یہ سب گوارا کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہ طعنہ کس کان سے سنوں کہ میں منصور سے محبت کرتی ہوں۔ اُسے چاہتی اور منصور کی ڈھٹائی تو دیکھو، میرے منہ پر کہتا ہے کہ میں شاکر سے نفرت کرتی ہوں اور اسے چاہتی ہوں۔ شاکر سے طلاق لینا چاہتی ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ یا اللہ زمین بھی پھٹ جاتی کہ میں اس میں سما جاتی۔ آسمان بھی نہیں ٹوٹ پڑتا کہ مجھے ڈھانپ لے!

یہ تاثر رضیہ پر ایسا غالب آیا کہ وہ بے بلائے سسرال سے میکہ چلی گئی۔ اُسے آس تھی وہاں وہ اس ذہنی اذیت اور دماغی کوفت سے نجات پا جائے گی۔ وہاں اسے کوئی طعنہ نہیں دے گا۔ وہاں نہ منصور ہوگا نہ اس کی بے حجابانہ سرگرمیاں

میکے پہنچ کر واقعی اس نے سکون سا محسوس کیا۔ سسرال میں وہ جس الجھن میں گرفتار تھی۔ یہاں کہیں اس کا پتہ بھی نہ تھا۔

ایک روز گھر میں غلغلہ مچا۔ ہاشم آگیا۔ ہاشم آگیا۔

ہاشم اس کا خالہ زاد بھائی تھا۔ بچپن میں دونوں ساتھ کھیلے تھے۔ بڑی بے تکلفی اور محبت سے رہتے تھے۔ یہ دونوں بچپن جوانی میں تبدیل ہونے لگا۔ مگر ان دونوں کے ربط و ضبط میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہی بے تکلفی، وہی ہنسی وہی مذاق!

پھر وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ولایت چلا گیا۔ اور لوگ دو تین برس میں آجاتے ہیں مگر وہ چھ برس میں بھی نہیں آیا۔ باپ نے تار دیئے۔ ماں نے خط لکھے۔ خالہ نے التجا کی۔ مگر ہاشم سب کو بھول چکا تھا۔ ہر خط میں دوسرے جہاز سے آنے کا وعدہ کرتا تھا۔ مگر نہیں آتا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔

آج کامل چھ سال کے بعد ہاشم آیا تھا۔ وہ جب گیا تھا تو رضیہ چودہ سال کی الھڑ لڑکی تھی۔ اب واپس آیا۔ تو وہ بیس سال کی ایک نوجوان عورت تھی۔ دونوں میں بہت تغیر ہو گیا تھا۔ ہاشم میں بھی اور رضیہ میں بھی۔ لیکن دونوں اس طرح ملے۔ گویا چھ سال کا زمانہ پھر لوٹ آیا ہے۔ وہی بے تکلفی۔ وہی ہنسی وہی مذاق!

سسرال میں رضیہ کو جو ذہنی اور دماغی تکلیف پہنچی تھی میکہ میں ہاشم کے آنے سے بالکل دور ہو گئی۔ اس سے مل کر وہ اپنے عہد طفلی میں واپس چلی جاتی تھی۔ اسے بالکل بھول جاتی تھی کہ ابھی چند روز پہلے وہ کن مصیبتوں میں گرفتار تھی۔

ہاشم ایک خوبرو نوجوان تھا۔ اعضا متناسب، صورت دلکش۔ باتیں دل موہ لینے والی۔ چہرہ پر رعب بھی اور ملاحت بھی۔

ہاشم اور رضیہ گھنٹوں اور پہروں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ ان دونوں کو باتوں کے سوا اور کام بھی کیا تھا۔ ہاشم دیارِ فرنگ کے قصے مزے سے لے کر سناتا کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے۔

رضیہ بے فکر ہو کر اس کی باتیں سنتی۔ کرید کرید کر اس سے سوال کرتی۔ بار بار وہاں کی رنگینیوں کا ذکر چھیڑتی۔ ایک دفعہ کہیں باتوں باتوں میں ہاشم نے کہہ دیا تھا میں نے ایک لڑکی مس شیرن سے معاشقہ کیا تھا۔ لیکن وہ بے وفا نکلی۔ اس نے مجھے خوب لوٹا۔ پھر شادی سے انکار کر دیا۔ ہاشم جب اس کا ذکر کرتا۔ اسے دو چار گالیاں ضرور دیتا بہت ستایا گیا تھا۔ وہ رضیہ ہنس ہنس کر مس شیرن کے قصے سنتی وکیلانہ قابلیت سے جرح کرتی۔ طرح طرح سے اس کا تذکرہ چھیڑتی۔ ہاشم اگر اس موضوع سے کبھی کتراتا تو وہ چھیڑتی تکلیف ہوئی ہوگی۔ تمہیں اس ذکر سے چھوڑو: اس قصے کو۔ کچھ اور باتیں کرو۔ بعض دفعہ ہاشم تلملا اٹھتا۔ بگڑ کر کہتا۔ رضیہ تمہیں اس سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ کیا اس لئے وہ عورت ہے۔ اس لئے تم اس کی حمایت کرنا چاہتی ہو؟ اس کا پارٹ لینا چاہتی ہو؟"

اس نوک جھونک کے بعد پھر دونوں حسبِ معمول گھل مل کر باتیں کرنے لگتے۔

گپ بازی وہ موضوع ہے۔ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ ہفتوں بات کرتے رہیئے۔ مگر تکلم جمی رہے گی۔ یہی حال ان دونوں کا تھا۔ ان کی باتیں ختم ہی نہیں ہوتی تھیں

باب ۶

ایں گل دیگر شگفت

اپنے پائیں باغ میں رضیہ ٹہل رہی تھی۔ شام کو اکثر وہ وہیں چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ ہاشم آگیا۔ وہ بھی اس کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ دونوں ٹہلتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی کسی درخت کے پاس رک جاتے تھے۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

رضیہ نے کہا۔

"ہاشم! تم نے دنیا جہاں کی سیر کی ہے۔ نہ جانے کتنی کتابیں چاٹ چکے ہو۔ اور اب بھی جب دیکھو کچھ نہ کچھ پڑھا کرتے ہو۔ ایک بات پوچھوں بتاؤ گے؟"

"ضرور بتاؤں گا۔ پوچھو!"

"محبت کی ماہیت کیا ہے؟ کہتے ہیں۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ مگر میں تو اس کے برعکس ہی پایا سنتی ہوں۔ محبت بے اثر نہیں رہتی۔ مگر میں نے تو اس کو کبھی نہیں دیکھا!"

"یہ تم مجھ پر چوٹ کر رہی ہو!"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ تم مجھ سے لطف و محبت کی باتیں کرتی ہو۔ مگر میں ان کی قدر نہیں کرتا۔ ہے نا یہی بات؟"

"خوب سمجھے۔ ہوش میں ہو۔ میں پوچھ کیا رہی تھی؟ اور تم کہنے کیا لگے؟"

"رضیہ اب ٹالو نہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے یورپ کی رنگینیاں دیکھیں۔ میں نے فرانس کی سرمستی کا نظارہ کیا۔ میں نے اطالیہ کے مہوشوں کو دیکھا۔ میں نے امریکہ کے گل رخوں کا نظارہ کیا۔ میں نے اسپین کی سیاہ چشم حسینوں کو دیکھا۔ لیکن ——

تو نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث۔
بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی!

"تم ہر جگہ میری آنکھوں میں بسی رہیں۔ تمہیں یہ کہیں نہ بھول سکا۔ جب سے ہندوستان آیا ہوں عشق کا سودا پھر سما گیا ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔"

"ہاشم! عقل کے ناخن لو۔ ایک سانس میں کتنی باتیں کہہ گئے ہو تم؟ میں ایک شخص کی بیوی ہوں۔ اس سے مجھے محبت ہے۔ اس کی بے التفاتی اور سرد مہری کے باوجود میں اسے چاہتی ہوں۔ اس کا مجھے خیال آیا۔ میں نے تمہارے علم اور تجربہ کی مدد سے اس مشکل کو حل کرنا چاہا اور تم لگے آئیں بائیں شائیں کرنے۔ کچھ پاگل ہو گئے ہو —— ؟ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ مجھے ان سے وحشت ہوتی ہے۔"

"رضیہ! تم وہ عہد وفا بھول گئیں۔ جو ہماری خاموش زبانوں نے ہماری معصوم آنکھوں نے ہمارے بے لوث تعلق نے باندھا تھا۔ وہ دن تمہیں یاد نہیں آتے جو ہم تم نے ہنس کھیل کر کاٹے تھے۔ وہ لڑائیاں اور ان کے ہنگامے وہ ملاپ اور اس کے ترانے ان میں سے تمہیں کچھ بھی یاد نہیں آتا۔ سب بھول گئیں تم؟ کتنی ظالم کتنی بے مروت ہو تم!"

"پھر وہی باتیں۔ جو کچھ کہتے ہو سب ٹھیک ہے لیکن اب ہو کیا سکتا ہے؟ میری ایک دوسری دنیا آباد ہو چکی۔ اسے ویران کیسے کروں؟"

"چاہو تو کر سکتی ہو اس ویرانی کی بنیاد پر نشاط و طرب کا قلعہ تیار کر سکتی ہو۔"

"وہ کس طرح؟"

"شاکر سے طلاق لے لو۔ مجھ سے شادی کر لو۔"

"(برہمی کے ساتھ) کیا کہا؟"

"شاکر سے طلاق لے لو۔ مجھ سے شادی کر لو۔ اور کیا۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے؟"

"شرم کاہے کی؟ میں تم سے یہ کب کہتا ہوں کہ میرے ساتھ کہیں بھاگ چلو۔ میں تم سے یہ مطالبہ کب کرتا ہوں کہ میرے ساتھ پرائیویٹ طور پر ناجائز تعلقات قائم کرو۔ میری تم سے یہ فرمائش کب ہے کہ تم کوئی خلاف اصول، خلاف شرع خلاف شرافت حرکت کرو۔ میں نے تو بڑی اصولی اور سیدھی بات کہی ہے۔ ایک شخص ہے جو حسن اتفاق سے تمہارا شوہر ہے۔ لیکن تمہیں بالکل نہیں چاہتا۔ ایک دوسرا شخص ہے۔ جو تمہیں بہت چاہتا ہے اور بدقسمتی سے تمہارا شوہر نہ بن سکا۔ پھر کیا یہ حماقت

ہے کہ تم اس سے محبت کرتی رہو۔ جو تمہیں ذرا بھی نہیں چاہتا اور اسے
ٹھکرادو۔ جو تمہیں پوجتا ہے۔"

"تم لاکھ تقریریں کرو ہاشم، مگر جو تم چاہتے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔"

"یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ کیوں؟"

"میں شاکر سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔"

"اگرچہ وہ وفا کو الٹی چھری سے ذبح کرتا رہے؟"

"وہ جانیں ان کا کام"

"ہندوستانی عورتوں کی یہی تو کمزوری ہے۔ یورپ کو دیکھو۔ کتنی ترقی یافتہ
عورتیں ہیں اور کس سکھ سے بسر کر رہی ہیں۔ ارے بھئی شادی تو اپنی پسند اور اختیار کی
چیز ہے۔ بھتی ہے تو شوق سے۔ نباہ ہو نہیں سکتی تو ہٹاؤ اس بکھیڑے کو۔ کیسا شوہر
کہاں کی بیوی؟"

"تو کسی یورپین عورت سے کیوں نہیں کر لی تم نے شادی؟"

"حماقت کی"

"اب بھگتو اسے"

"تو میں تم سے مایوس ہو جاؤں؟"

"میں نے جو کہنا تھا کہہ چکی"

"رضیہ یہ تمہارے دل کی آواز نہیں ہے۔ سماج کی دہشت، خاندان کے ڈر
اور رسوائی کے خوف سے تم یہ کہہ رہی ہو۔"

"یہاں میں ہوں اور تم ہو۔ نہ سماج ہے، نہ خاندان ہے۔ نہ رسوائی ہے۔

یہاں مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بہرحال میں اپنی کوشش جاری رکھونگا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جب تک زندہ ہوں تمہیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہونگا۔"

"اچھی زبردستی ہے یہ۔"

"زبردستی ہی۔"

"کیا کروگے تم؟"

"جو کچھ کر سکتا ہوں"

"واقعی تمہیں مجھ سے محبت ہے؟"

"بے حد۔"

"پھر تم وہ بات کیوں کرنا چاہتے ہو جو میری دلی تکلیف کا سبب ہے؟"

"اسی کا تو میں قائل نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے تم مجھے چاہتی ہو۔"

"کیوں یقین ہے؟"

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے"

"پھر شاکر بھی مجھے چاہتا ہے؟"

"زہرہ کا گھر بسا کر؟"

"یہی سہی"

"اچھا ایک بات پر سمجھوتہ کر لو"

"وہ کیا؟"

rekhta

"تم غیر جانبدار رہو۔ میں سب کچھ بھگت لونگا۔"

"جس بات کی میں مخالف ہوں۔ اس میں غیر جانبداری کا کیا سوال؟"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ رضیہ کی چھوٹی بہن صغریٰ آگئی۔ اس کے آتے ہی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

باب ۲

دو رقیب

شاکر باہر سے ابھی ابھی واپس آیا تھا۔ مردانہ میں بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ کہ ہاشم پہنچا۔ اس نے شاکر سے ہاتھ ملایا اور بے تکلفی کے ساتھ کہا۔ میں اپنا تعارف خود کرا دوں۔ میرا نام ہاشم ہے۔ رضیہ میری خالہ زاد بہن ہے۔ میں کئی برس تک ولایت میں رہا۔ اب ہندوستان آیا ہوں۔ آپ شاکر ہی صاحب ہیں نا؟

"جی ہاں! میرا نام شاکر ہے۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر تشریف رکھئے۔ چائے حاضر ہے۔"

"جی نہیں میں چائے نہیں پیوں گا۔ آپ سے ایک اہم مسئلہ پر گفتگو کرنے آیا ہوں۔"

"فرمائیے! ارشاد"

میری آپ کی یہ گفتگو پوری صفائی اور سچائی کے ساتھ ہوگی۔"

"ہاں ہاں شوق سے کہیئے۔"

"میں آپ کے گھر پر بھکاری بن کر آیا ہوں۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

"آپ وعدہ کیجئے۔ مجھے مایوس نہیں واپس کریں گے۔"

"مجھ سے آپ کی جو خدمت ہو سکے گی۔ کروں گا۔"

"میں چاہتا ہوں......"

"فرمائیے! فرمائیے!!"

"آپ ہمارے راستے سے ہٹ جائیں۔"

"کیا مطلب؟ میں آپ کے راستے میں کس طرح حائل ہوں۔"

"حائل ہیں آپ"

"کس طرح؟ فرمائیے تو کچھ"

"آپ رضیہ کو طلاق دے دیجئے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

"آپ نہایت کمینے آدمی ہیں۔ براہ کرم یہاں سے تشریف لے جائیے"

"میں ابھی چلا جاؤں گا۔ آپ صرف ہاں کہ دیجئے۔"

"ملازم کو آواز دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ جانے سے بہتر یہ ہے کہ آپ خود چلے جائیں۔"

"آپ ملازم کو بلائیں۔ یا مرد میدان بن کر مجھ سے کشتی لڑیں۔ میں اس چیلنج کے قبول کرنے سے گھبراتا نہیں لیکن آپ کو رضیہ سے دستبردار ہونا ہی پڑے گا۔"

"آپ مجھے حکم دے رہے ہیں؟"

"جی ہی۔"

"میں آپ کا حکم ماننے سے انکار کرتا ہوں۔"

"پھر نتائج کے ذمہ دار آپ ہونگے۔"

"کر لیجئے جو آپ کا جی چاہے۔"

(جیب سے پستول نکال کر) "میں فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو مہلت دیتا ہوں۔ جائیے آپ بھی پستول لے آئیے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ ایک دوسرے پر وار کریں۔ جو مر جائے وہ جنتی ہے۔ جو زندہ رہے وہ دنیا میں رضیہ کا مالک بنے۔"

اب شاکر کو تاب ضبط نہ رہی۔ وہ "ابھی آیا" کہہ کر گیا۔ الماری سے اس نے پستول نکالا۔ اور اسے لے کر باہر چلا۔ امی جان نے یہ منظر دیکھا تو دہل اٹھیں۔ بجلی کی سی تیزی سے سامنے آ گئیں۔

"یہ کیا بیٹا؟"

"مجھے باہر جانے دو"

"اس طرح کیوں؟ پستول کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہاشم کو ماروں گا"

"کون ہاشم؟"

"رضیہ کا نیا عاشق۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ آیا ہے۔ باہر کھڑا ہے۔ کہہ رہا ہے تم رضیہ کو طلاق دے دو۔ میں اس سے شادی کروں گا۔"

"بیٹا! اپنا مال کھوٹا پرکھنے والے کا کیا دوش؟ صاحبزادی ہی جب نئے نئے عاشق پیدا کرتی ہیں۔ تو کسی اور کو کیا الہنا دیں۔ تم بیٹھو۔ میں ہاشم سے باتیں کرتی ہوں"۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ وہ میرے پاس آیا ہے۔ اس نے مجھ سے سوال کیا ہے۔ میں اسے جواب دونگا"۔

اتنے میں پستول دغنے کی آواز باہر کے کمرہ سے آئی۔ شاکر یا دامن چھڑا کر تیزی سے باہر کے کمرہ میں پہنچا۔ ہاشم کھڑا ہوا تھا۔

"پستول تم نے کس پر چلایا؟"

"دروازہ پر"

"کیوں؟"

"تم نے اتنی دیر آنے میں کیوں لگائی؟ میں تمہیں اتنا بزدل نہیں سمجھتا تھا۔ میں انتظار نہ کر سکا۔ میں نے تنبیہی فائر کر دیا۔ یاد رکھو۔ آئندہ تمہیں مہلت نہیں ملیگی"۔

"میں مہلت نہیں چاہتا۔ یہ دیکھو میرے ہاتھ میں پستول ہے میں مقابلہ کرونگا۔ سنبھالو اپنا پستول۔ کرو حملہ"۔

"اب نہیں پھر کبھی"

"یہ کیوں؟"

"ایک ہی گولی تھی میرے پستول میں۔ وہ ختم ہو گئی"۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ جب چاہو آؤ۔ یہ دروازہ ہر وقت کھلا ہے تمہارے لئے"۔

"شکریہ!"

یہ کہہ کر ہاشم چلا گیا۔

شاکر پھر اندر پہنچا۔ اتنی دیر میں اماں جان نے نہ معلوم کتنی آیتوں کی تلاوت کر ڈالی تھی۔ انہوں نے جو صحیح سلامت شاکر کو آتے دیکھا تو خوش ہو گئیں۔ پوچھا۔

"کیا ہوا بیٹا؟"

"ملتوی ہو گیا مقابلہ۔ پھر کسی دن ہو گا"۔

"کیوں؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے"

"چھوڑ دو نا رضیہ کو۔ ایسی بے راہ لڑکی کو بیوی بناتے تمہیں شرم نہیں آتی؟"

"یہ پستول پہلے رضیہ پر چلے گا۔ پھر منصور پر۔ پھر ہاشم پر۔ پھر مجھ پر"۔

"بیٹا! ہوش میں آؤ۔ اپنی ماں پر رحم کرو"۔

"اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں میرے گھر میں۔ میرا چھوٹا بھائی اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے گھر میں ہاشم اس کا عاشق پیدا ہوا ہے وہ بھی اسکا شوہر بننا چاہتا ہے۔ وہ بھی مجھ سے یہی کہتا ہے کہ میں رضیہ کو طلاق دے دوں۔ میرا گھر نہ ہوا۔ اس کے عاشقوں کا مورچہ ہو گیا۔ میں ضرور اسے مار دونگا۔ اس کے عاشقوں کا صفایا کر دونگا۔ پھر اپنا خاتمہ بھی کر دونگا"۔

"اچھا پستول مجھے دے دو"۔

"تم اسے کیا کرو گی؟"

"رکھ دوں گی احتیاط سے۔ پھر لے لینا"۔

"تو رکھ لو۔ ہاں! صبح آدمی بھیج کر رضیہ کو بلوا لو"۔

"بلوا لوں اُسے؟"

"ہاں!"

"کیوں بلواتے ہو اُسے؟ لعنت بھیجو اس پہ۔ زہرہ ہی سے شادی کرلو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ یہاں آئے گی یہیں اس کی قبر بنے گی۔ اس کی قبر پر منصور، ہاشم اور میری قبریں بنیں گی۔ ایک ہی دن میں، ایک ہی وقت میں، ایک ہی جگہ پر۔"

"میں تو نہیں بلواتی"

"اگر تم نے نہ بلوایا تو تم میرا منہ کبھی نہ دیکھ سکو گی۔ اس گھر میں آگ لگا دونگا۔"

"اچھا بلواؤں گی۔ لیکن تم اپنے تئیں قابو میں تو رکھو۔"

شاکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر چلا گیا۔

باب ۳

زہرہ

گھر سے نکل کر شاکر سیدھا زہرہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ اس وقت اداس اور پریشان تھا۔ زہرہ نے خلافِ معمول اس رنگ میں جو اسے دیکھا تو پوچھا۔

"کیا بات ہے چپ چپ کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں"

"کسی سے لڑائی ہوئی ہے؟"

"نہیں تو"

"تمہیں ہمارے سر کی قسم نہ بتاؤ تو ہمارا مرا ہوا دیکھو۔"

"کچھ خانگی تفکرات ہیں"

"بیگم صاحبہ سے چل گئی؟"

"چھوڑو ان باتوں کو ——— ہاں! تم نے آغا حشر کا ڈرامہ 'آنکھ کا نشہ'

دیکھا؟

"دیکھا"

"کیسا ہے وہ"؟

(مسکرا کر) "ہم لوگوں کی خوب پول کھولی ہے۔ طوائفوں کا ایسا برا رخ پیش کیا ہے کہ خدا کی پناہ"

"پھر غلط ہے کچھ"؟

"سچ سہی لیکن ہمیں طوائف بناتا کون ہے؟ تم ہی جیسے شریف شرفا"

"ہم لوگوں نے کیا طوائفوں کی ٹریننگ کے لئے کوئی کالج کھول دیا ہے"؟

"کالج؟ تم میں کا ہر شخص بجائے خود کالج ہے۔ جس کی دی ہوئی ڈگری عورت کو طوائف بنا دیتی ہے۔"

"ہماری سمجھ میں نہیں آتیں یہ باتیں"

"کیوں آنے لگیں۔ کور دب رہی ہے نا؟"

"تمہارا خیال ہے کہ طوائفیں از خود بڑی معصوم ہوتی ہیں"؟

"یقیناً۔ طوائف کیوں کہتے ہو۔ عورت کہو۔ ہر عورت کی فطرت معصوم ہوتی ہے لیکن یہی ذات شریف مرد اسے لالچ دیتا ہے۔ اسے سبز باغ دکھاتا ہے۔ اس کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسے مجبور کرتا ہے اور اپنی ہوس رانی کا آلہ بنا لیتا ہے۔ پھر جب اس کا جی بھر جاتا ہے تو صفا بتا دیتا ہے اور کسی دوسری نوخیز کلی کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔"

"آج تو بڑی عجیب باتیں کر رہی ہو تم!"

"جو چاہو کہہ لو۔ لیکن ہیں سچی باتیں۔"

"زہرہ! میں یہ تو مانتا ہوں کہ طوائفوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جسے حالات نے طوائف بنا دیا ہے۔ لیکن تم موروثی اور خاندانی طوائفوں کے بارے میں کیا کہو گی۔ کیا وہ ماں کے پیٹ سے طوائف نہیں پیدا ہوتیں۔ کیا وہ اسے اپنا پیدائشی حق نہیں سمجھتیں کہ آدم کے بیٹوں کو پرچائیں۔ لبھائیں۔ اپنا اسیر دام کریں۔"

"میں اس نظریہ کو نہیں مانتی۔ آپ لوگ طوائف کو ایک گھناؤنی چیز سمجھتے ہیں اور وہ ہے بھی ایسی ہی۔ لیکن راتوں کو چھپ چھپ کر اس کے بالاخانے پر پہنچتے ہیں۔ آپ اسے مکار بے وفا خود غرض سمجھتے ہیں اور وہ ہوتی بھی ایسی ہی ہے۔ لیکن جب تک آپ اس کے درشن نہ کرلیں آپ کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ آپ اسے آبرو باختہ عصمت فروش اور بے حیا سمجھتے ہیں اور میں مانتی ہوں کہ یہ الزام ثابت ہے۔ پھر بھی آپ حضرات اپنی وفادار عصمت مآب۔ شوہر پرست بیویوں کو چھوڑ کر ان کے ارمانوں اور آرزوؤں کو قتل کرکے انہیں جھڑک کر۔ اور ان کی وفاداریوں سے منہ موڑ کر ہمارا کاشانۂ عشرت آباد کرتے ہیں۔"

"تو اس سے کیا ہوا؟"

"اس سے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس سے یہ ہوا کہ آپ نے اپنے وقتی جذبہ کی تسکین کے لئے ہم سے وہ چیز خریدی جو ہم بیچ کر اور آپ خرید کر نفع میں نہیں رہتے بلکہ کچھ گھاٹا ہی اٹھاتے ہیں۔"

شاکر خاموش بیٹھا رہا۔ زہرہ نے کچھ دیر رک کر کہا:

"آپ ہمیں بے حیا کہتے ہیں۔ میں کہتی ہوں تم میں بے حیا کہنے والے خود بے حیا۔

ہیں"

"گالی اور کوسنے کی سند نہیں بھیجی"

"یہ گالی نہیں سچائی ہے۔ میں ایک بات پوچھتی ہوں"

"ضرور پوچھو"

"برا نہ مانیے گا"

"برا کیوں مانیں گے۔ پوچھو!"

"اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ آپ کی بیوی کسی دوسرے سے تعلق رکھتی ہے۔ کسی غیر سے راہ و رسم رکھتی ہے، کسی اجنبی کو چاہتی ہے تو آپ کی کیا حالت ہوگی ——؟ بتائیے —— سچ کہیے گا۔ مر جانے اور مار ڈالنے کو جی چاہیگا آپ کا، ہے نہیں لیکن وہی خوددار اور باغیرت شوہر جب ہمارے بالاخانے کے پہلے زینے پر قدم رکھتا ہے تو اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی چیز خریدنے جا رہا ہے جو بکنے کے بعد بھی کسی ایک کی نہیں ہے بلکہ بہتوں میں مشترک ہے۔ ہر گاہک اس کے دام لگاتا ہے اور ادا بھی کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کی خاطر اور دلجوئی بھی کرتا ہے۔ اس کے ناز بھی اٹھاتا ہے اور ستم بھی سہتا ہے۔ پھر بھی اسے اپنا نہیں کہہ سکتا۔ اسے پا نہیں سکتا۔ اسے بلا شرکت غیرے اپنے تصرف میں اپنی بیوی کی طرح نہیں لا سکتا —— باایں ہمہ وہ ہمارے بالاخانہ پر آکر آدمی رہتا ہے اور گھر میں جاتے ہی ہلاکو بنجاتا ہے۔ ہمارے ہاں اپنے حریفوں اور رقیبوں سے بھی وہ گرم جوشی سے ہاتھ ملاتا ہے۔ جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ جس کا چہرہ دیکھنے کی ہمت سورج کو بھی نہیں ہوتی جس کی پاکدامنی پر فرشتے گواہ ہیں۔ اس کے پاس جب جاتا ہے تو تیوریاں چڑھی

ہوئی ہیں اور چہرہ مبارک پر برہمی کے آثار ہویدا ہیں"

"تم ثابت کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"یہ آپ اب تک نہیں سمجھے؟"

"بالکل نہیں"

میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ بیوی کے ساتھ بدسلوکی کرکے اور طوائف کے جنس مشترک بنے رہنے پر بھی اس کی قدم بوسی کرکے آپ عورت کو طوائف بناتے ہیں۔ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں"

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ تماشبین بالاخانوں پر پستول اور ڈنڈے کر چڑھا کریں اور جس رقیب کو دیکھیں اسے وہیں ڈھیر کر دیں؟ جس طوائف کو غیر وفادار پائیں اس کا سر توڑ دیں؟"

"اگر تم میں غیرت ہوتی تو دنیا میں طوائف نام کی کوئی چیز نہ ہوتی"

"اس کا ہمت سے کیا تعلق ہے؟ رسے بھئی ایک آدمی بالاخانہ پر آیا۔ بیٹھا، محظوظ ہوا، قیمت ادا کی اور چلا گیا۔ اسے ان بکھیڑوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ کون آیا۔ کون گیا۔ کون رہا؟

ع مارا چہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت!

"مسافر آئے۔ بیٹھے۔ چلے گئے"

"اسی کو میں ہوس پرستی کہتی ہوں"

"تو ہم ہوس پرست ہیں کیوں؟"

"میں کسی کا نام تو لیتی نہیں۔ یہ جامہ جس کے راس آجائے نیرہ بقول" یہ

کہہ کر زہرہ دل سے ہنسی۔ لیکن شاکر سنجیدہ بنا بیٹھا رہا۔ اُس نے پوچھا۔

"میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے"؟

"کیا مطلب؟"

"میں ہوس پرست ہوں یا حُسن پرست"؟

"میں نہیں جانتی"

"تمہیں بتانا پڑے گا"

"اور اگر میں نہ بتاؤں؟"

"تو میں یہاں آنا جانا بند کردوں گا"

"آپ سنجیدگی سے پوچھ رہے ہیں تو سنیئے!"

"بوالہوس"

(اچھل کر) "تم مجھے بوالہوس سمجھتی ہو؟"

"جی ہاں!"

"پھر ایک بوالہوس سے یہ ربط ضبط۔ یہ رسم و راہ کیوں"؟

"ہمارا پیشہ یہی ہے۔ ہم ولی اللہ کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں"؟

"مجھے اگر یہ معلوم ہوتا کہ تم میرے متعلق یہ رائے رکھتی ہو۔ تو ہرگز میں تم
میل جول نہ بڑھاتا"

"شاکر صاحب! خفا ہونے کی بات نہیں۔ آپ نے میل جول میرے کہنے
نہیں بڑھایا۔ آپ آج چاہیں تو اسے ختم کرسکتے ہیں۔ یہ کچھ نکاح تو ہے نہیں
کر طلاق دینے میں رسوائی کا اندیشہ ہو۔ خاندان والوں سے جھگڑے کا اندیشہ

مہر کے دعوے کا اندیشہ ہو۔ یہ تو کچا دھاگا ہے۔ جب تک چاہے ڈھیل دیجیے۔
جب چاہے ذرا سا جھٹکا دے کر توڑ دیجیے۔ باقی رہا میری رائے کا معاملہ سو وہ
رائے صرف آپ ہی کے بارے میں نہیں ہے۔ سب کے بارے میں ہے خواہ آپ
ہوں خواہ سیٹھ کندن مل، چاہے راجہ نوازش علی ہوں، چاہے سیٹھ اکبر علی میں سب کو
بوالہوس سمجھتی ہوں"

"سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا کہاں کی دانائی ہے؟"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ آپ بوالہوس نہیں ہیں؟"

"ہرگز نہیں"

"مجھ سے محبت کرتے ہیں؟"

"بہت زیادہ"

"آپ مجھ سے نکاح کیوں نہیں کرلیتے؟"

"کروگی نکاح تم؟"

"ہاں! لیکن کچھ شرطیں ہیں میری"

"وہ بھی کہہ ڈالو"

"میرا مہر ایک لاکھ ہوگا!"

"ایک لاکھ؟"

"جی ہاں ایک لاکھ"

"یہ بہت ہے"

"یہ اعتراض آپ نے اپنی شادی کے وقت بھی کیا تھا؟ کیا آپ کی بیوی کا مہر

ایک لاکھ نہیں ہے؟ آپ خود ہی کہہ چکے ہیں۔ آپ کریئے گا نہیں؟"

"ہے لیکن ایک مرتبہ میں نے حماقت کی تو دوسری بار بھی کروں؟"

"جی یہ حماقت نہیں چالاکی ہے!"

"کیا کہا چالاکی؟"

"جی ہاں چالاکی۔ ہوشیاری۔ عیاری!"

"وہ کس طرح؟"

"خاندانی نکاح کے وقت آپ مطمئن تھے کہ مہر کا مطالبہ نہیں ہوگا۔ نہ آپ طلاق دینگے اور مجھ سے نکاح کے وقت دونوں باتوں کا اندیشہ ہے۔"

"مان لیا سچ ہے تمہارا خیال۔ پھر؟"

"ہی ہوا ہوسی"۔

"مجھے سمجھاؤ تو اپنا مطلب!"

"مطلب یہ کہ آپ ساٹھ ستر روپیہ پر یا ہزار دو ہزار مہر پر نکاح کریں اور اس طرح مجھے باقاعدہ اپنی کنیز بنالیں۔ پھر جب جی بھر جائے تو وہی سلوک میرے ساتھ کرنے لگیں۔ جو اب رضیہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ میں اگر فریاد کروں تو میرا منہ نہ دیکھیں۔ شکایت کروں تو طلاق کا پروانہ بھیج کر گلو خلاصی حاصل کریں اور پھر کسی اور کو ڈھونڈ لیں۔ شاکر صاحب! آپ لوگوں نے انسانی فطرت کا حال کتابوں میں پڑھا ہے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ برتا ہے۔ پرکھا ہے۔ آپ ہم سے اڑ کر نہیں جا سکتے!"

"خوب!"

"خوب اور ناخوب سے بحث نہیں۔ ایمان سے کہیئے غلط کہہ رہی ہوں میں؟"

"نہیں بھائی ہم تو تمہاری ولایت کے قائل ہو گئے۔"

"یہ وجہ ہے کہ رنڈیاں اپنے دائرہ سے باہر نہیں نکلتیں۔ یہ وجہ ہے۔ کہ وہ مجبور ہو کر رنڈی بن جاتی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ وہ مردوں کے پندار کو تاشے کی طرح توڑا کرتی ہیں۔"

اسی اثنا میں زہرہ کی امّی جان خراماں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ سر کا دوپٹہ جوشِ سخن میں ذرا ڈھلک گیا تھا۔ اس نے اسے ٹھیک کیا اور شاکر نے سگریٹ سلگانا شروع کر دیا۔

"بڑی بی کے آتے ہی یہ مجلس مباحثہ ختم ہو گئی۔

شاکر نے کہا۔

"اب میں جاتا ہوں"

"جائیے"۔ زہرہ نے جواب دیا۔

"بڑی بدتمیز چھوکری ہے۔ بڑی آئی میرے لڑکے کو بھیجنے والی! بیٹھو بیٹا! پان کھاؤ۔ تمہیں دیکھنے کو آنکھیں ترستی رہتی ہیں۔"

بڑی بی گرجیں۔

"اس وقت تو معاف کیجئے۔ ایک ضروری کام ہے۔ پھر حاضر ہونگا۔"

"پھر کب؟ کل آؤ نا!"

"بہت اچھا!"

"اور بیٹا وہ ہماری کشمیری شال؟"

"وہ بھی کل لیتا آؤں گا۔"

"جیتے رہو۔ خدا دل کی مرادیں پوری کرے۔"

شاکر نے گھر کی راہ لی۔ زہرہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور بڑی بی گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ کر اپنی گڑگڑی پینے لگیں۔

باب ۹

دو دو باتیں

شاکر گھر پہنچا۔ جیسا اداس گیا تھا۔ اس سے کچھ زیادہ اداس واپس آیا۔ آتے ہی بستر پر لیٹا اور سو گیا۔

صبح وہ ناشتہ کر رہا تھا کہ منصور آ گیا۔ شاکر نے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن مخاطب نہیں ہوا۔ منصور کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"آپ نے کچھ فیصلہ کیا؟"

"کیسا فیصلہ؟"

"بھول گئے آپ! وہی رضیہ کے بارے میں۔"

"مت بکو۔ نکل جاؤ یہاں سے"

"میں ابھی چلا جاؤں گا یہاں سے لیکن مجھے آپ کا عندیہ معلوم ہونا چاہیئے۔ کیا تم چاہتے ہو میں خودکشی کر لوں؟"

بھروسہ نہیں رہا۔ میں اسے ضرور قتل کردونگا۔"

"آپ نے کیسے جانا یہ؟"

"وہ ایک دوسرے آدمی سے بھی محبت کرتی ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"ہے کوئی۔"

اسی اثنا میں شاکر کا ایک پرانا دوست مسعود آگیا۔ شاکر اخاہ کہہ کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ شاکر کو دیکھ کر کچھ ٹھٹکا۔ پھر اسے گھورا۔ پھر لپک کر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور کہا۔ کیا بات ہے۔ آج تمہارا چہرہ کھلکھلا نہیں رہا ہے۔ میں دو تین مہینے سے کاروبار کے سلسلہ میں غائب تھا۔ اس اثنا میں کیا حادثہ پیش آیا؟

کچھ نہیں۔ آؤ بیٹھو۔ باتیں کرینگے۔ ابھی مسعود اور شاکر پاس بیٹھ گئے۔ منصور اندر چلا گیا اور ان دونوں دوستوں میں باتیں شروع ہوگئیں۔ شاکر نے ازاول تا انتہا سارا دکھڑا مسعود کو بادیدۂ پرنم سنادیا۔

مسعود نے کہا۔ منصور کو تم سنبھالو۔ ہاشم میرا بچپن کا یار ہے۔ میں اس سے ملتا ہوں۔

باب ۱

فلسفیانہ باتیں

شام کو شاکر حسب معمول زہرہ کے پاس پہنچا۔ آج بھی وہ کچھ مضمحل سا تھا۔ لیکن کل سے کم۔ اسے دیکھتے ہی زہرہ پان بنانے بیٹھ گئی۔ اس نے بیڑا بنا کر شاکر کو دیا اور پوچھا

"کیسا مزاج ہے حضور کا؟"

"نہیں کیا؟ اچھا ہوں۔"

"کچھ غصہ اترا سرکار کا؟"

"پاگل ہوگئی ہو۔ غصہ کیسا؟"

"میری باتیں آپ کو بری تو بہت معلوم ہوتی ہونگی۔"

(مسکرا کر) "کچھ کچھ!"

"پھر کیا سزا تجویز کی آپ نے ہمارے لئے؟"

قتل کر ڈالو ہمیں یا جرم الفت بخش دو — دو کھڑے ہیں ہاتھ باندھے ہم تمہارے سامنے

"بڑی سخت سزا!"

"پھر دیر کیا ہے؟"

"تیار ہو تم سزا بھگتنے کے لئے؟"

"بسر و چشم"

"مجھ سے شادی کر لو"

"یہ سزا نہیں ہے"

"پھر؟"

"انتقام"

"کیا کہا۔ انتقام؟"

"جی ہاں! انتقام!"

"میں تم سے انتقام لونگا؟ کاہے کا؟ یہ بھی تو سوچو!"

میری باتیں اس دن آپ کو بہت کھلیں۔ انہی کا بدلہ لینے کی سوچی ہوگی آپ نے۔"

"توبہ توبہ۔ تم مجھ سے اتنی بدگمان ہو زہرہ؟"

"دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کے پیتا ہے۔"

"مجھے تم سے یہ امید نہ تھی"

"پھر بگڑ گئے آپ؟"

"بات ہی ایسی کرتی ہو۔"

"کیا بات کی میں نے؟"

"اتنا کچھ کہہ گئیں اور کچھ کیا ہی نہیں؟"

"تو غلط کہا میں نے؟"

"بالکل غلط۔"

"سچ کہتے ہیں آپ؟"

"ایک ایک حرف سچ ہے!"

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ انہیں نیچ سمجھتے ہیں۔ حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں کمینہ اور بیوفا سمجھتے ہیں مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا زیادہ صاف الفاظ میں ہوس کے تقاضے سے بے بس ہو کر آپ بہار سے یہاں آتے ہیں اور دل بہلاتے ہیں۔ ہوس کی آگ ٹھنڈی کرتے ہیں۔ اور چلے جاتے ہیں!"

"میرا اور غنچہ کا جہاں تک تعلق ہے یہ غلط ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس لئے آتا ہوں۔ تم میں شرافت پاتا ہوں اس لئے محبت کرتا ہوں۔ تم میں شائستگی اور وقار دیکھتا ہوں اس لئے کھنچتا ہوں۔ سچ کہنا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"صرف یہی بات نہیں ہے!"

"پھر کیا ہے؟"

"دیکھئے نا۔ اگر یہی بات ہوتی۔ تو سچ بتایئے گا۔ آپ کی بیوی میں شرافت نہیں۔ وہ شائستگی اور وقار نہیں ہے؟ پھر محبت کا سمندر اس کے سینہ میں لہریں نہیں مار رہا ہے؟ یہ محبت کی بارش اس پر کیوں نہیں ہوتی جس نے مجھے زیر بار کر دیا ہے۔ یہ چاہت کا سیلاب اس پر کیوں نہیں امنڈتا جس نے مجھے غرقاب کر رکھا ہے؟

میرے متعلق آپ حلف لے کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں پاک دامن ہوں لیکن اپنی بیوی کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ وہ معتوب اور میں محبوب؟

"تو غلط کہا میں نے؟"

"بالکل غلط"

"سچ کہتے ہیں آپ؟"

"ایک ایک حرف سچ!"

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ ہمیں نیچ سمجھتے ہیں۔ حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں کمینہ اور بیہودا سمجھتے ہیں مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا زیادہ صاف الفاظ میں ہوس کے تقاضے سے بے بس ہو کر آپ ہمارے ہاں آتے ہیں اور دل بہلاتے ہیں۔ ہوس کی آگ ٹھنڈی کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں"

"میرا اور تمہارا جہاں تک تعلق ہے یہ غلط ہے میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس لئے آتا ہوں۔ تم میں شرافت پاتا ہوں اس لئے محبت کرتا ہوں۔ تم میں شائستگی اور وقار دیکھتا ہوں اس لئے کھنچتا ہوں۔ سچ کہنا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"صرف یہی بات نہیں ہے!"

"پھر کیا ہے؟"

"دیکھئے نا۔ اگر یہی بات ہوتی۔ تو سچ بتایئے گا۔ آپ کی بیوی میں شرافت نہیں ہے شائستگی اور وقار نہیں ہے؟ سچی محبت کا سمندر اس کے سینہ میں لہریں نہیں مار رہا ہے؟ یہ محبت کی بارش اس پر کیوں نہیں ہوتی جس نے مجھے زرخیز کر دیا ہے۔ یہ چاہت کا سیلاب اس پر کیوں نہیں امڈتا۔ جس نے مجھے غرقاب کر رکھا ہے؟

میرے متعلق آپ حلف لے کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں پاک دامن ہوں لیکن اپنی بیوی کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ وہ معتوب اور میں محبوب؟

"زہرہ! یہ بات نہیں ہے"

"پھر کیا بات ہے جناب!"

"میری بیوی اتنی بلند نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو اُسے"

"یعنی"

"اس کا چال چلن مشکوک ہے میری نگاہ میں"

"کیا مطلب؟"

"وہ دوسروں کو چاہتی ہے"

"واقعی؟"

"سچ کہتا ہوں میں"

"وہ ایک کو نہیں کیئوں کو چاہتی ہے؟"

"ہاں"

"پھر تو میری نظر میں اس کی عزت اور بڑھ گئی"

"بہت خوب! یہ کیوں؟"

"بڑے کردار کی ہے وہ عورت!"

"یہ کیسے؟"

"اس نے آپ سے بدلہ لے لیا اور جو عورت مرد کی زیادتیوں کا بدلہ لے لے میری نظر میں وہ دیوی ہے"

"تو کر لو مجھ سے شادی تم بھی۔ لیتی رہنا مجھ سے بدلے"

"جتنا اچھا بدلہ میں یہاں رہ کر لے سکتی ہوں۔ آپ کے گھر جا کر نہیں لے سکتی

"تو میں سمجھ لوں تم انکار کرتی ہو۔ تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟"

"کروں گی۔ لیکن ایک شرط ہے۔"

"بلا سُنے ہوئے منظور۔"

"جی نہیں سن کر منظور کرنی پڑے گی وہ۔"

"اچھا تو کہہ ڈالو۔"

"شاہد کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"تمہارا بھائی ہے وہ"

"وہ ہے کیسا؟"

"بہت نیک۔ بہت ہونہار۔ بہت ذہین۔ بہت قابل۔ بی اے کے امتحان میں اوّل آیا ہے"

"یہ سب باتیں آپ مانتے ہیں؟"

"ہاں ہاں! کون کافر انکار کر سکتا ہے ان حقائق کا۔"

"پھر اس کی شادی ......"

"ہاں ہاں میرے ذمہ رہی کسی اچھے گھرانے میں اس کی شادی کرا دونگا میں۔"

"جی اس کی سند نہیں۔"

"پھر؟"

"اپنی بہن ثریا سے شادی کرائیے گا اس کی۔"

"ثریا سے شاہد کی شادی؟"

"پھر چونکے آپ! کون سا غضب ٹوٹ پڑے گا اس شادی سے؟"

"یہ بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

"یہ بہکی بہکی باتیں ہیں؟"

"پھر کیا؟"

"باتوں کی ضرورت نہیں جواب دیجیے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں"

"یہ ناممکن ہے"

"کس لیے؟"

"اس مسئلہ پر گفتگو مت کرو زہرہ!"

"اتنی ناگوار ہوئی آپ کو یہ بات؟"

"یہی سمجھ لو۔"

"پھر آپ مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ میں اس قابل ہوں کہ آپ کی بیوی بن سکوں۔ لیکن میرا بھائی اس قابل نہیں ہے کہ آپ کی بہن کا شوہر بن سکے؟ حالانکہ اس کی ذہانت اور قابلیت کو آپ بھی مانتے ہیں۔ اس کی شرافت اور نیکی کے آپ بھی قائل ہیں۔ پھر یہ بات بھی نہیں ہے کہ اسے آپ شریف نہ سمجھتے ہوں۔ ابھی آپ کہہ چکے ہیں کہ اس کی شادی کسی شریف اور اچھے گھرانے میں کرا دینگے۔ گویا وہ اس قابل تو ہے کہ کسی شریف اور اچھے گھرانے میں اس کی شادی آپ کرا دیں۔ لیکن اس قابل نہیں ہے۔ کہ آپ کے سے شریف اور اچھے گھرانے میں دُولہا بن کر جا سکے۔ کیوں ہے نا یہی بات؟"

"یہی سہی"

rekhta

"میں بھی خوب دکھتی ہوئی رگ آپ لوگوں کی پکڑتی ہوں۔"

"میں مانتا ہوں۔"

"اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ آپ فریبی ہیں۔ دغاباز ہیں۔ جھوٹے ہیں۔"

"یہ سب تم نے کیسے سمجھ لیا؟"

"آپ شاہد کی شادی کسی شریف اور اچھے گھرانے میں کرانے کا وعدہ جو کر رہے تھے۔"

"اس وعدہ پر تو میں اب بھی قائم ہوں۔"

"تو کیا آپ کا گھرانا شریف نہیں ہے؟ اچھا نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں ہے۔"

"پھر چراغ تلے اندھیرا کیوں؟ اسے چھوڑ کر دوسری جگہ آپ زحمت کیوں کریں گے؟"

"تمہیں آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے؟"

"دونوں سے۔"

"تو ہو چکی شادی"

"یہ تو میں پہلے سے جانتی تھی۔"

"یہ کہ میں جھوٹا ہوں۔ فریبی ہوں۔ دغاباز ہوں۔"

"ہاں جی!"

"آخر کس طرح؟"

شاہد کی شادی آپ کس طرح کراتے؟ یا تو کسی شریف گھرانے کو یہ دھوکا دیتے

کہ شاہد بڑا شریف اور خاندانی لڑکا ہے اور شادی کر دیتے پھر بعد میں راز افشا ہوتا تو آپ دامن جھٹک کر الگ ہو جاتے۔ یا کسی اچھے لیکن تباہ حال اور غریب گھرانے کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے اور اُسے سبز باغ دکھا کر شاہد کو داماد بنا لینے پر آمادہ کر لیتے۔ لیکن خود صاف بچ جاتے۔ اپنے گھر میں اس کمینہ کا سایہ بھی نہ پڑنے دیتے۔"

"تم بہت تلخ باتیں کرتی ہو زہرہ۔"

"سچ کڑوا ہی ہوتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ بتاؤ۔ کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

"ابھی تک آپ کو میرا فیصلہ نہیں معلوم ہوا؟"

"تم نے فیصلہ کیا کب؟"

"کر لیا"

"آج سے آپ غریب خانہ پر تشریف نہ لایا کریں۔"

"شادی تو شادی اب گھر میں آنا بھی ممنوع ہو گیا؟"

"جی ہاں"

"آخر اس کی وجہ؟"

"اتنے تجربے حاصل کر چکی ہوں کہ اب مجھے نئے تجربے حاصل کرنے کی تمنا نہیں رہی۔"

"اچھا شادی نہ سہی۔ لیکن ہمارے تمہارے تعلقات کیوں ٹوٹیں؟"

"جو تعلقات کچے دھاگے سے زیادہ کمزور ہوں ان کا ٹوٹنا ہی بہتر ہے۔"

"تو میں سمجھ لوں۔ یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"بالکل آخری۔ قطعی!"

"تو میں جاؤں؟"

"شوق سے۔ ہمیشہ کے لئے"

شاکر اٹھا تھا کہ زہرہ کی ماں آ گئی۔ اس نے زہرہ کے تیور اور شاکر کا چہرہ دیکھ کر بھانپ لیا۔ کچھ رنگ بگڑا ہوا ہے۔ شاکر سے کہنے لگی "بیٹھو بیٹا! ابھی آئے۔ ابھی چلے"

زہرہ نے بگڑ کر کہا: "اماں! تم ہمارے معاملے میں مت بولا کرو"

"واہ ری چھوکری میرے گلے کیوں پڑ رہی ہے؟"

"تم شاکر صاحب کو کیوں روک رہی ہو؟"

"میرا گھر ہے"

"تو میں اس گھر کو چھوڑ دوں گی۔ تم اپنے پاس بلایا کرنا۔ انہیں خوب جی بھر کے"

"کیا بک رہی ہے شنقل"

اسی بحث و گفتگو میں شاکر چلا گیا۔ بڑی بی نے دیکھا شاکر نکل گیا ہے۔ الجھنا بیکار ہے۔ وہ بھی ڈھیلی پڑ گئیں اور چپ چاپ اپنے کمرہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔

باب ۱۱

شاہد اور ثریا

علی پور سے بی اے کی سند لے کر ابھی حال ہی میں ثریا واپس آئی تھی اور یہاں آتے ہی اس نے ایم اے کلاس میں اپنا داخلہ کرا لیا۔ علی پور گرلز کالج کے سیکرٹری خان بہادر غلام علی نے ایک پر زور سفارشی خط بھی یہاں کالج کے پرنسپل کو لکھ دیا تھا۔ اس لئے ثریا کو داخلہ میں بہت سہولت ہوئی۔ علی پور میں اس کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔

ثریا کی عمر ۱۷-۱۸ سال کی ہوگی۔ بڑی صبیح و ملیح، بڑی شوخ اور چنچل، بڑی بذلہ سنج اور حاضر جواب۔ جس محفل میں بیٹھ گئی رونق آ گئی۔ جس گروہ میں پہنچ گئی۔ زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ثریا اتنی حسین نہیں تھی جتنی سحر طراز تھی۔ ناک نقشہ معمولی آدمیوں کا سا۔ رنگ بھی کچھ سانولا۔ لیکن کشش اس بلا کی تھی کہ لوگ خود بخود اس کی طرف کھنچتے تھے۔ جو نگاہ اس پر اٹھ جاتی تھی وہ واپسی کا راستہ بھول جاتی تھی۔ منجمد ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں، باتوں میں اور اداؤں میں جادو تھا۔ وہ سراپا جادو تھی۔ کالج کے پروفیسر ہوں یا طالب علم، اس کی سہیلیاں ہوں یا استانیاں، چند ہی روز میں سب اس کے اسیر ہو گئے۔

۵

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
ایک ہی زلف کے اسیر ہوئے

کالج کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ ثریا نے اس قدر جلد قبول عام حاصل کر لیا تھا۔ اس کے ہم سبق لڑکوں میں ایک شاہد بھی تھا۔ لیکن وہ دو ہی چار ملاقاتوں میں وہ ثریا سے مسحور ہو گیا۔

ثریا نئی تھی۔ شاہد پرانا تھا۔ شاہد کو کالج کی لڑکیاں مولانا صاحب کہا کرتی تھیں۔ (وہ) حسن مردانہ کا شاہکار تھا۔ لیکن بے نیاز، بے پروا، بے ذوق۔ اس کی بے ذوقی کی یہ انتہا تھی کہ صنف جمیل کے مساعی جمیلہ بھی اسے اسیر رنگ و بو نہ کر سکے۔ وہ کالج کی رنگ رلیوں کے ہجوم میں تنہا تھا۔ نہ کبھی وہ کسی لڑکی سے مخاطب ہوا۔ نہ اس نے کسی سے پینگ بڑھائے۔ نہ عشق و محبت کی اس نے پرسش کی۔ اسے اپنے کام سے کام تھا۔ منصورہ، ساجدہ کی خاص توجہ تھی شاہد پر۔ لیکن مایوس کرم ہونے کے بعد انہوں نے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ "مولانا صاحب" کا خطاب انہی کی ایجاد تھی۔

لیکن اب ہوا بدل رہی تھی۔ بنجر زمین پر گل بوٹے کھل رہے تھے۔ چٹیل میدان میں چمن طرازی ہو رہی تھی۔ کانٹا گل رعنا کا پیکر اختیار کر رہا تھا۔ شاہد اور ثریا کی ملاقات جلد بے تکلفی میں اور بے تکلفی بہت جلد انس اور ارتباط میں بدل گئی۔ پتھر کی چٹان پر محبت کی کھیتی لہلہانے لگی۔

ایک دن منصورہ اور ساجدہ میں اسی موضوع پر بحث چھڑ گئی۔ ساجدہ نے منصورہ سے کہا۔

"بستی ہو"

"کیا؟"

"ابھی انجان تو نہ ہو۔

سنا ہے کسی اور کو چاہتا ہے
وہ دشمن ہمارا وہ پیارا تمہارا"

"صرف میرا ہی؟ تمہارا پیارا بھی تو تھا وہ!"

"لیکن اب تو نہ ہمارا ہے وہ نہ تمہارا۔"

"کیا جادو کر دیا اس ثریا کی بچی نے؟ یہ جادو نہیں تو کیا ہے؟ گونگا بولنے لگا۔ بہرہ سننے لگا۔ اندھا دیکھنے لگا۔ پہلے شاہد گونگا تھا۔ اب ثریا کے سامنے بلبل کی طرح چہکتا ہے۔ پہلے وہ بہرہ تھا۔ اب وہ پریم کے نغمے اس کے کانوں میں گونجا کرتے ہیں۔ پہلے وہ اندھا تھا۔ لیکن اب اس کا دعویٰ ہے کہ وہ حسن شناس ہے!"

"ہاں۔ وہ کیا؟"

"مان لی ہار تم نے؟"

"اور تم نے؟"

"ہرگز نہیں"

"کیا کرو گی تم؟"

"اس چھوکری کا طلسم توڑ کر رہوں گی۔"

"دیکھوں گی"

"دیکھ لینا"

اتنے میں ثریا اور شاہد آتے ہوئے دکھائی دئے۔ ثریا آگے آگے تھی اور شاہد پیچھے پیچھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں درسی کتابیں تھیں۔ یہ دونوں آئے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کلاس میں پروفیسر محمود کا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔

پروفیسر صاحب شاہد سے مخاطب تھے اور شاہد کی آنکھیں ثریا کا معائنہ کر رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر حاضرین نے ایک قہقہہ لگایا۔ شاہد چونکا۔ ثریا نے نظریں کتاب پر گاڑ دیں۔ پروفیسر صاحب مسکرانے لگے۔

باب ۱۲

اور سماج......؟

مسعود اور شاکر بچپن کے ساتھی تھے بڑے گہرے دوست تھے۔ یہ دونوں ابتدائی مدرسہ سے لے کر کالج تک دونوں کی تعلیم ساتھ ساتھ ہوئی۔ پھر شاکر نے گھر اور جائداد کا کام والد کے انتقال کے سبب سنبھال لیا۔ اور مسعود ولایت چلا گیا۔ جہاں مسعود اور ہاشم کی دوستی ہوئی اور برابر بڑھتی رہی۔

مسعود کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ ہاشم اور شاکر میں کیسے اختلافات ہیں۔ کس طرح کی دشمنی ہے؟ کیوں چلی ہوئی ہے؟ وہ بالکل انجان تھا۔ لیکن شاکر نے اسے سب کچھ پڑھا دیا تھا۔ آج وہ تیار ہو کر آیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ ہاشم سے لڑے گا۔

ہاشم بڑے تپاک سے ملا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ڈرائنگ روم میں لایا۔ پوچھا۔

"اچھے تو ہو؟"

"ہاں! خدا کا فضل ہے!"

"بہت دنوں میں درشن ہوئے؟"

rekhta

"تم اس قابل کب ہو کہ شریف لوگ تم سے ملیں جلیں"

"کیوں جناب یہ کیا فرمایا آپ نے؟ اس کا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم بڑے ذلیل ہو"

"آخر کیوں؟"

"تمہیں عشق بازی کے لئے رضیہ کے سوا کوئی اور نہیں ملتا تھا؟"

ہاشم نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس نے کہا۔

"اب سمجھا استاد۔ آپ شاکر کے سفیر بن کر آئے ہیں؟"

"یہی سہی پھر؟"

"تم نے شاکر کی سب سُن لی۔ کچھ میری بھی تو سنو!"

"ہاشم! مجھے تم سے نفرت سی ہونے لگی!"

"ارے بندۂ خدا! پہلے ماجرا تو سن لے۔ پھر دیتے رہنا فتوے!"

"کہہ ڈالو تم بھی۔ کیا کہتے ہو؟"

"دیکھو بھئی میں جو کچھ کہتا ہوں، غور سے سننا"

"بالکل ایک جج کی طرح سنونگا۔ کہو"

"رضیہ میری خالہ زاد بہن ہے۔ بچپن سے آغاز شباب تک کا زمانہ ہمارا ساتھ گذرا۔ یہ دور ہماری پاک معصوم اور بے لوث محبت کا تھا۔ پھر میں ولایت چلا گیا۔ رضیہ شاکر کے پلہ باندھ دی گئی۔ میں واپس آیا۔ میرا دبا ہوا جذبہ محبت پھر ابھر آیا۔ میں اسے ہر قیمت پر ابھرنے سے روکتا۔ اگر میں یہ دیکھ لیتا کہ رضیہ شاکر سے خوش ہے۔ اس کی گھریلو زندگی لائق اطمینان ہے۔ زن و شوہر کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کیا؟ میں نے دیکھا شاکر اس کی بات بھی

نہیں پوچھتا۔ اس کی صورت بھی نہیں دیکھتا۔ اس سے کسی قسم کا واسطہ بھی نہیں رکھتا۔ وہ کڑھ رہی ہے، اذیت اور تکلیف کی زندگی بسر کر رہی ہے اور وہ؟ وہ زہرہ کیساتھ داد عیش دے رہا ہے۔

"زہرہ کون؟"

"ہے ایک طوائف"

"بالانشین؟"

"ہاں! لیکن کم خرچ نہیں!"

مسعود مسکرایا۔ ہاشم نے پھر سلسلہ گفتگو جاری کیا۔

"تو جو شخص اپنی بیوی سے محبت نہ کرتا ہو شریفانہ طور پر اس سے نباہ نہ کرتا ہو اس کے دکھ سکھ کا شریک نہ ہو، اور اپنا دل بہلانے کے لئے دوسرے اڈے اس نے بنائے رکھے ہوں اسے حق ہے کہ وہ اسے اپنی رفیقۂ حیات بنائے رکھنے پر اصرار کرے؟ میں تم سے پوچھتا ہوں۔ ایمان سے بتاؤ۔ اخلاق، قانون، شرع کا کیا فتوےٰ ہے؟"

"اور سماج؟"

"سماج کی میں کوئی وقعت نہیں کرتا"

"کیوں؟"

"ہماری تمام کمزوریوں اور قومی بیماریوں کا سبب صرف یہ ہمارا سماج ہے"

"وہ کیسے؟"

ہمارا مذہب کہتا ہے۔ بیوہ عورت شادی کر سکتی ہے۔ لیکن سماج کا حکم ہے۔ ہرگز نہیں مذہب کا فتویٰ ہے۔ اگر میاں بیوی میں نہ بنے تو طلاق کے ذریعہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن سماج شوہر کو اجازت دیتی ہے کہ وہ رنڈی بازی جی بھر کے کرے۔ متعدد

نئی شادیاں کرے۔ لیکن جس بیوی سے اس کا دل میل نہیں کھاتا۔ اسے بھی طلاق نہ دے۔
زندہ درگور کئے رکھے۔ مذہب کا فرمان ہے کہ ذات پات، نسل رنگ، وطن اور خاندان کی کوئی
حیثیت نہیں۔ ہر مسلمان بھائی بھائی ہے۔ لیکن اس عقیدہ پر ایمان رکھنے والی سماج اسے
کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی کہ اونچ نیچ کا امتیاز دور ہو جائے۔ نسل و رنگ کا تفرقہ ختم ہو
جائے۔ وہ ان چیزوں کو پروان چڑھانا چاہتی ہے۔ مذہب ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ چادر دیکھ
کر پاؤں پھیلاؤ۔ لیکن سماج کا فتویٰ ہے۔ کنگال ہو جاؤ۔ مگر روایات خاندانی پر اولوالعزمی
سے عمل کرتے رہو۔ اور پھر جب کنگال ہو جاؤ۔ تو یہ سماج ایک پیسہ سے بھی مدد کرنے کا
روادار نہیں ہوتی۔ ہمارا مذہب ہر چیز میں سادگی کو ترجیح دیتا ہے۔ نمائش سے روکتا ہے۔
فضول خرچی کی مخالفت کرتا ہے۔ لیکن سماج کے ہاں یہ ناقابل معافی گناہ ہیں۔ شادی کرو
سُود پر روپیہ قرض لے کر مرنے کے بعد فاتحے کرو۔ گھر کے برتن گرو رکھ کر۔ تنخواہ ہو تمہاری
پچاس روپیہ ماہوار۔ لیکن مہر باندھو سوا لاکھ کا۔ آمدنی ہو تمہاری سو روپیہ ماہوار کی لیکن بچے
کے عقیقہ پر۔ بچی کی بسم اللہ پر، بیوی کے غسل صحت پر آنکھ بند کر کے خرچ کرتے رہو اور
دیوالیہ بن جاؤ! اسلام نے عورت اور مرد کے حقوق مقرر کر دیئے ہیں۔ حدود کے اندر عورت
کو بھی پوری آزادی دی ہے۔ نکاح و طلاق کے معاملے میں اسی کی رائے فیصلہ کن ہے۔ لیکن
تمہاری سماج عورت کے حقوق پامال کرتی ہے۔ اُسے بالکل غیر شرعی پردہ پر مجبور کرتی ہے
نکاح و طلاق کے بارے میں ان کی رائے دریافت کرنا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ جائیداد میں اسلام
عورت کو حق دیتا ہے۔ لیکن سماج نے وہ حق چھین لیا ہے۔ ایسے سماج کو میں قابل نفرت
سمجھتا ہوں۔ مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔"

"بڑی دلچسپ تقریر کر ڈالی تم نے؟"

"ٹالو نہیں۔ بتاؤ میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"ایک ایک حرف سچ!"

"پھر مجھے کیوں نصیحت کرتے ہو۔ شاکر کو نصیحت کیوں نہیں کرتے کہ وہ رضیہ کو طلاق
دے دے۔ تاکہ وہ سکون کی زندگی بسر کر سکے۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ"

"پوچھو"

"خود رضیہ کی کیا رائے ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"وہ طلاق حاصل کرنا چاہتی ہے؟"

"نہیں"

"پھر تم مدعی سست گواہ چست کے مصداق کیوں بنے ہوئے ہو؟"

"وہ سماج سے ڈرتی ہے۔"

"اس لئے طلاق سے گریز کرتی ہے؟"

"ہاں!"

"وہ تم سے محبت کرتی ہے؟"

"کرتی ہے"

"ثبوت؟"

"میں جو اس سے محبت کرتا ہوں"

"میں جذباتی ثبوت نہیں چاہتا۔ واقعات سے بحث کرتا ہوں۔"

"پھر کیسا ثبوت چاہتے ہو؟

"اس نے تم سے اقرارِ محبت کیا؟"

"نہیں"

"اس نے شاکر سے نفرت کا اظہار کیا؟"

"نہیں"

"اس نے اپنی موجودہ زندگی میں تبدیلی کی خواہش کی؟"

"نہیں"

"اس نے تمہارے ساتھ کوئی مخصوص اور امتیازی برتاؤ روا رکھا؟"

"یہ بھی نہیں"

"پھر تمہیں یہ سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتی"

"وہ یقیناً مجھ سے محبت کرتی ہے"

"لیکن اس کا اعتراف کرتے ہوئے شرماتی ہے؟"

"سماج سے ڈرتی ہے۔ رسوائی سے خوف کھاتی ہے۔ بدنامی کی دہشت اُسے محتاط بنا دیتی ہے"

"یہ کوئی بات نہیں ہوتی"

"پھر؟"

"دیکھو ایک بات میں بتاتا ہوں"۔

"کہو"

"تم رضیہ سے صاف صاف گفتگو کرو"۔

"اس سے کیا ہوگا؟"

"اگر وہ تم سے اقرارِ محبت کرے، شاکر کے خلاف نفرت کا اظہار کرے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری خدمات حاضر ہیں۔ میں شاکر کو مجبور کر کے رہونگا کہ وہ رضیہ کو طلاق دے دے"۔

"یہ سب کچھ ہونا مشکل ہے"۔

"کیوں؟"

"وہ بڑی ضابطہ و صابر ہے"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"وہ مر جائے گی لیکن وہ اپنے اور اپنے خاندان کے نام پر کلنک کا ٹیکہ نہیں لگائے گی۔ کوئی ایسی بات نہیں کرے گی جو وضع کے خلاف ہو۔ خاندانی روایات کے خلاف ہو۔ جس سے بدنامی ہوتی ہو"

"ایک دفعہ کوشش تو کر دیکھو"

"کر چکا کوشش"

"کیا ہوا اس کا نتیجہ؟"

"وہی جو تم سے کہہ چکا ہوں"

"یعنی اس نے اقرارِ محبت تم سے نہیں کیا؟"

"صاف انکار کر دیا"

"وہ طلاق لینے پر راضی نہیں ہوتی؟"

"بالکل نہیں"

"تم رضیہ کا خیال چھوڑ دو۔"

"چھوڑ دوں رضیہ کا خیال؟"

"ہاں بالکل"

"اسے گھٹ گھٹ کے مرنے دوں؟"

"جب وہ خود چاہتی ہے تو تم اسے کیونکر روک سکو گے؟"

"اگر شاکر اس سے دست کش ہو جائے، تو وہ سنبھل سکتی ہے۔ اس کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے لیکن تم عورت کی فطرت سے ناواقف ہو۔"

"اور آپ بڑے ماہر فطرت ہیں؟"

"میں تم سے زیادہ تجربہ رکھتا ہوں۔ تم ولایت میں رہ کر بھی نرے بدھو رہے اور میں نے یورپ کی نسائیت میں غرق ہو کر مشرق کی نسائیت میں جذب ہو کر ہندوستان کی نسائیت کا اکسیر کر کے عورت کی فطرت پہچان لی ہے۔"

"تو کس نتیجہ پر پہنچے تم؟"

"بتا دوں؟"

"ضرور بتاؤ"

"خفا تو نہیں ہو گے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"رضیہ شاکر سے محبت کرتی ہے۔"

"شاکر سے؟"

"ہاں! صرف شاکر سے"

"تم احمق ہو۔ غلط سمجھ رہے ہو اسے"

"احمق تم ہو تم غلط سمجھ رہے ہو اسے"

"کیونکر؟"

"عورت کی افتاد مزاج کا رخ آسانی سے نہیں سمجھا جا سکتا۔"

"اور صاف کہو"

"عورت کے لئے یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ وہ اسی سے محبت کرے جو اس سے محبت کرتا ہو وہ اس سے بھی محبت کرتی ہے جو اس سے نفرت کرتا ہو بلکہ کبھی کبھی اس کی توہین کر دیتا ہو۔ ارے میاں ایسے آدمی سے وہ محبت نہیں عشق بیتابانہ اور مجنونانہ اور سرفروشا عشق کر ڈالتی ہے۔ یہ کوئی کلیہ بھی نہیں پیش کر رہا ہوں۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ایسا بھ ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ عورت جس طرح محبت کا جواب محبت سے دیتی ہے اسی طرح بے تعلقی بیگانگی اور بیزاری کا جواب بھی کبھی کبھی محبت سے دیتی ہے۔ اس کی محبت ہر حالت میں اٹل ہوتی ہے۔ اسے کوئی ڈانواڈول نہیں کر سکتا۔ کوئی طاقت اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کر سکتی۔ کوئی رکاوٹ اس کے راستہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ و پہاڑ کی طرح ناقابل تسخیر ہوتی ہے۔ وہ چٹان کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔ باد مخالف کا کوئی جھ اسے اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔"

"تو تمہاری رائے یہ ہے!"

"ہاں بھئی میری رائے تو یہی ہے"

"میں سمجھ لوں شاکر سے رضیہ محبت کرتی ہے"

"بچکے کہیں گے۔ یہ تو تمہیں بہت پہلے سمجھ لینا چاہئے تھا۔ وہ اگر شاکر سے محبت نہ کرتی ہوتی۔ تو کب کی تمہاری ہو چکی ہوتی۔ تم شاکر سے زیادہ خوبصورت ہو۔ شاکر سے زیادہ دولت مند ہو۔ شاکر سے زیادہ اس سے قربت رکھتے ہو۔ پھر بھی وہ تمہاری طرف ملتفت نہیں ہوتی۔ اور شاکر سے علیحدگی کا نام بھی سننا اسے گوارا نہیں"

"مجھے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں ہے"

"نہ ہو اتفاق۔ لیکن تم مجھے برسر غلط نہیں ثابت کر سکتے"

"تم سے بحث میں کون جیت سکتا ہے"؟

"تم جیسا بات تو ڈھ بھی نہیں"

"نہیں بالکل نہیں"

اتنے میں اطلاع آئی۔ کہ کھانا تیار ہے۔ ہاشم نے مسعود کا ہاتھ پکڑا اور لے کھانے کے کمرے میں لے گیا۔

باب ۱۳

تصویر کے دونوں رُخ

دوسرے روز مسعود شاکر کے ہاں پہنچا اور آتے ہی برس پڑا۔ اس نے کہا۔

"بھئی بے سر پیر کی باتیں کرتے ہو تم!"

"کیا ہوا؟"

"تم نے تصویر کا ایک رُخ دکھا کر مجھے خوب بے وقوف بنایا"

"کیا مطلب؟"

"میں سمجھ گیا"

"کیا سمجھے تم؟"

"تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرما لیا آپ نے"

"ہاں! ہے تمہارے پاس کوئی جواب؟"

"اچھا جو کچھ ہاشم کہتا ہے؟"

"کیا کہتا ہے وہ؟"

مسعود نے جو کچھ ہاشم سے سنا تھا۔ سب بیان کیا۔ پھر پوچھا۔ کہو اب کیا کہتے ہو؟"

شاکر نے کہا۔ "ہاشم نے جو الزامات مجھ پر لگائے ہیں ان کی واقعیت سے انکار نہیں کرتا۔ اس نے میرے کردار کے جو رخ تمہیں دکھائے ان کی صفائی بھی میں نہیں دینا چاہتا۔ اس نے میرے اور رضیہ کے تعلقات کی جو تصویر کھینچی - وہ بھی کچھ زیادہ غلط نہیں ہے۔ بلکہ ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ میں رضیہ کو طلاق نہیں دے سکتا۔ نہ جانے کیوں میرا دل اس پر مائل نہیں ہوتا۔"

"سماج کے ڈر سے"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں سماج کی زیادہ پروا نہیں کرتا۔ میں خود اس دورنگی اور دوعملی سے عاجز آچکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں۔ یک رنگ زندگی بسر کروں۔ میرے دل پر زہرہ کا راج ہے۔ لیکن جب میں اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں تو ہر قربانی کے لئے اپنے تئیں آمادہ پاتا ہوں مگر اس کے لئے نہیں۔ میں واقعی اب رضیہ میں وہ جاذبیت اپنے لئے نہیں پاتا۔ جو پہلے اس میں تھی۔ لیکن اسے چھوڑ دوں اور اسے چھوڑ کر اپنی جنت بساؤں یہ سوچ کر میرے دل میں کچھ ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ میں عجیب کشمکش میں گرفتار ہوں۔

یہ کہتے کہتے شاکر کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

مسعود نے کہا۔ شاکر سمجھ سے کام لو۔ ایک اہم ترین معاملہ زیر بحث ہے۔ جس پر ایک سے زائد زندگیوں کا دارومدار ہے۔ یہ مسئلہ سرسری طرح طے نہیں ہو سکتا۔

کہ تم آنسو بہاتے رہو۔ یا لفاظی کو اپنی سپر بنا کر اپنے تئیں بچانے کی کوشش کرو۔

سوال یہ ہے کہ اگر تمہیں رضیہ سے محبت ہے تو تمہارا طرز عمل بیزاری اور نفرت کا آئینہ دار کیوں ہے؟ اگر محبت اسی طرح کی جا سکتی ہے جس طرح تم کرتے ہو تو دنیا کی کون احمق عورت ہوگی۔ جو محبت کا جواب محبت سے دینا پسند کرے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ مرد کی یہی خود مختاری عورت کو بے راہ کرتی ہے۔ اس سے چکلے اور کوٹھی خانے آباد کراتی ہے۔ اس کی نظر میں وفا اور حیا، عصمت اور عزت کو حرف غلط بنا دیتی ہے۔

"کتنی دلچسپ محبت ہے تمہاری" تم محبت تو کرتے ہو رضیہ سے۔ لیکن اس کی بات تک نہیں پوچھتے پھر معاملہ یہیں نہیں ختم ہو جاتا۔ نہ صرف یہ کہ تم رضیہ کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیتے۔ تم اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتے۔ تم اس کی آرزوؤں اور امنگوں کا خیال نہیں کرتے بلکہ ایک دوسری عورت کو چاہتے ہو۔ اور وہ عورت بھی کون؟ بیسوا۔ تو اس کی خاطر دنیا سے بیگانے ہو گئے۔ تم نے اسے چاہا۔ اور اس کی گلی کے غبار راہ بن گئے۔ تم نے اس سے محبت کی اور سب کو فراموش کر دیا۔ تم نے اس کے لئے رضیہ کو وہ غم پہنچائے۔ اس طرح اس کا دل توڑا کہ اگر وہ کسی دوسرے مرد سے محبت کرنے لگتی۔ تو ہرگز قابل الزام نہیں تھی۔ مگر پھر بھی تم ثابت یہ کرنا چاہتے ہو کہ تم رضیہ سے محبت کرتے ہو!"

"تم غلط سمجھے"

"اچھا تو تم رضیہ سے نفرت کرتے ہو۔ اور زہرہ سے محبت کرتے ہو؟"

"یہ بھی نہیں"

"اچھا تو تم زہرہ سے محبت کرتے ہو۔ اور رضیہ سے نفرت نہیں کرتے؟"

"ہاں!"

"اسی لئے اسے چھوڑنا نہیں چاہتے؟"

"یہی بات ہے؟"

"گویا دوسرے الفاظ میں تمہارے نزدیک رضیہ کا' یا بالفاظ صحیح بیوی کا درجہ اسباب منقولہ میں ہے۔ چاہو تو اسے اپنے آرائش خانہ کی زینت بنائے رہو۔ چاہو تو اسے پھینک دو۔ نکال دو۔ خود اس کی رائے جذبات خیالات اور احساس کا تمہیں کوئی خیال نہیں ہے۔ یہ کتنی احمقانہ باتیں کر رہے ہو تم!"

"یعنی"

"یعنی یہ کہ زہرہ سے بھی پینگ بڑھاتے رہو۔ اور رضیہ کو بھی مجبور رکھو کہ وہ تمہاری بیوی بنی رہے!"

شاکر چپ چاپ سنتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد مسعود نے کہا۔

"کیا تم رضیہ کو بھی اس کی اجازت دو گے؟"

"کا ہے کی اجازت؟"

"کہ وہ تمہیں بھی چاہتی رہے اور ہاشم سے بھی محبت کرتی رہے؟"

"اس کی اجازت کون مرد دے سکتا ہے؟"

"کیا محبت میں بھی مردانہ ٹھاٹھ چلتا ہے؟"

"کیوں نہیں چلتا ہے؟"

"تمہیں حق ہے کہ تم ایک وقت میں دو نشانوں کو اپنا ہدف بناؤ۔ مگر زہرہ یا رضیہ کو اس کی اجازت نہیں ہے؟"

"ہرگز نہیں"

"تم اس وقت زہرہ یا رضیہ سے باتیں کر رہے ہو۔ لہٰذا رعب ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ جو میں پوچھتا ہوں۔ اس کا جواب دو۔"

"میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"کیوں؟"

"اس تصور سے میرا خون کھولنے لگتا ہے۔"

"یہ تو کوئی دلیل نہیں ہے۔ مرض ہے۔ علاج کراؤ۔"

"مسعود تم تو میرا مذاق نہ اڑاؤ۔"

"میں مذاق نہیں کرتا۔ تمہیں اس جنجال سے نکالنا چاہتا ہوں جس میں تم پھنس گئے ہو۔ تم نے وہ راستہ اختیار کیا ہے جو ہلاکت کا ہے۔ تم اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہو۔"

"تم مجھے پاگل سمجھ رہے ہو؟"

"اور کیا۔ آخر کس اصول کس فلسفہ، کس نظریہ کے تحت تم اس کا حق رکھتے ہو کہ رضیہ کا دل بھی کڑھاؤ۔ اور اس سے دعوائے محبت بھی کرو۔ رضیہ کے لئے ایک رقیب روسیہ کا انتظام بھی کرو۔ اور اس رقیب سے عشق و الفت کا کھیل بھی کھیلتے رہو۔ کون تمہاری اس دورخی محبت پر بھروسہ کر سکتا ہے۔ نہ رضیہ اتنی بیوقوف ہے' نہ زہرہ اتنی بھولی ہے۔

ہم معتقدِ دعوے باطل نہیں ہوتے!
پہلو میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے!

باب ۱۳

تیز و تند گفتگو

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ لیکن شاکر اور مسعود کی تیز و تند گفتگو برابر جاری تھی۔ بیچ میں چائے نوشی کے لئے کچھ دیر کے واسطے سلسلۂ گفتگو منقطع ہو گیا۔ لیکن ابھی چائے ختم نہیں ہوئی تھی کہ یہ دونوں مناظرہ کرنے والے پھر گتھ گئے۔

شاکر نے مسعود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کیا شرعاً میں ایک سے زیادہ بیویاں نہیں کر سکتا؟"

"دیکھو شاکر! شرع کو درمیان میں مت لاؤ"

"کیوں؟ کیا میں مسلمان نہیں ہوں؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم صرف مسلمان ہی نہیں۔ بلکہ مثیل خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ سہی۔ لیکن شرع سے نہ کھیلو"۔

"یہ کھیل ہے؟"

"بالکل وہ بھی اناڑی کا کھیل"۔

"کیسے؟"

"شرع نے آپ کو رنڈی بازی کی اجازت دی ہے"؟

"نہیں!"

"پھر زہرہ سے ناجائز تعلقات کیوں ہیں آپ کے"؟

"شرع نے تمہیں بیوی سے حسن سلوک کی تعلیم دی ہے"؟

"ہاں!"

"پھر رضیہ کی حالت مطلقہ سے بدتر کیوں ہے جناب"؟

"ہے شرع کا یہ حکم کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم میاں بیوی اچھی طرح نباہ نہ کر سکو گے تو خوش اسلوبی سے الگ ہو جاؤ۔ لیکن بیوی کو معلقہ بنا کر نہ رکھو!"

"ہاں ہے یہ حکم"

"پھر رضیہ معلقہ کیوں بنی ہوئی ہے"؟

"شرع نماز کی تاکید کرتی ہے"؟

"کرتی ہے!"

"لیکن تمہارے پروگرام سے نماز کیوں خارج ہے"؟

"شرع کا فرمان ہے۔ سائل کو مت جھڑکو"؟

"ہاں ہے"

"پھر ابھی اس فقیر کو تم شیر کی طرح کیوں گھور رہے تھے"؟

"شرع کا ارشاد ہے کہ مسلمان مسلمان بھائی بھائی ہیں"؟

"یقیناً"

"لیکن یہ محلہ کا کبڑا جو ابھی آیا تھا۔ غلاموں کی طرح حضور حضور کیوں کر رہا تھا؟ اس کی ہمت کیوں نہیں پڑی کہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ کرسی پر بیٹھتا؟"

"شرع نے غلاموں کے لئے حکم دیا ہے کہ جو خود کھاؤ وہ انہیں کھلاؤ۔ جو خود پہنو وہ انہیں پہناؤ۔"

"ہاں جانتا ہوں۔"

"لیکن نوکروں کے ساتھ بھی تمہارے ہاں مساویانہ سلوک کیوں نہیں ہے۔ کیا تم خود جو کھاتے ہو وہی وہ انہیں ملتا ہے؟ تم خود جو پہنتے ہو وہی وہ پہنتے ہیں۔ ان کے ساتھ کامل برادری اور مکمل مساوات کا برتاؤ کیوں نہیں ہے؟"

شاکر خاموش بیٹھا رہا۔ مسعود بھی کچھ دیر چپ رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"اسی لئے میں کہتا ہوں کہ شرع کو تم لوگوں نے کھلونا بنایا ہے۔ جب تک جی چاہا۔ اس سے کھیلا۔ جب جی بھر گیا۔ اسے چکنا چور کر دیا۔ تم شرع کے کسی حکم پر عمل نہیں کروگے۔ بلکہ چھانٹ چھانٹ کر اس کے احکام و ہدایات کی خلاف ورزی کروگے۔ لیکن تعدد ازدواج کے بارے میں تم شرعی پیکر بن جاؤگے۔"

"ہم اگر دوسرے شرعی احکام پر عمل کرتے ہیں تو غلطی کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے کسی مسئلہ پر عمل کرتے ہیں —— تو تم منع کرنے والے کون؟"

"اسی لئے کہ شرع کو آڑ بنا کر نفس کا تقاضا پورا کرنا چاہتے ہو۔"

"پھر وہی گالم گلوچ؟"

"دیکھو شاکر! تم غلط راہ پر چل رہے ہو۔ اور اس سے ہٹنا نہیں چاہتے۔ تو

تمہیں اختیار ہے۔ لیکن تمہیں ہرگز یہ حق نہیں ہے کہ تم اپنی ہوس رانیوں کا آلۂ کار شرع کو بناؤ۔"

"پھر وہی بے تکی باتیں؟"

"جانتے ہو شرع نے دوسری شادی کی اجازت دی ہے؟"

"ہاں مانتا ہوں"

"جانتے ہو دوسری شادی کے شرائط کیا ہیں؟"

"جانتا ہوں۔ مساوات، عدل۔"

"کر سکتے ہو تم؟"

"کیوں نہیں"

"جب شادی سے پہلے نہ کر سکے تو بعد میں کیا کر سکوگے تم؟

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

دوسری شادی کی اجازت اگر ہے بھی تو خاص حالت میں، جب واقعی وہ کسی مصلحت یا ضرورت کی بنا پر ناگزیر ہو جائے۔ وہ عیش پرستی کا اجازت نامہ نہیں ہے؟ سمجھے میاں شاکر!"

"خوب سمجھتا ہوں آپ کو بھی، اور آپ کے فتووں کو بھی۔"

"لیجئے خفا ہو گئے جناب شاکر صاحب؟"

"تم باتیں ہی ایسی کیوں کرتے ہو؟"

"میں پھر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے طرزِ عمل پر نظرثانی کرو۔"

"کر چکا"

"ایک راستہ اختیار کرلو۔"

"کر لیا۔"

"یا زہرہ کو اپنے دل کی کہیں بتاؤ یا رضیہ کو"۔

"میں تو دونوں کو بتاؤنگا"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"ہو کر رہے گا۔"

"یہ ناممکن ہے"

"میں ناممکن کو ممکن کردونگا"

"رضیہ تم سے محبت نہیں کرتی"۔

"کوئی مضائقہ نہیں"

"تو اسی سے عہد وفا نباہو۔ زہرہ کا خیال ترک کردو"

"مرد اپنے فیصلہ سے ہٹا نہیں کرتے۔ اور میں تو ان مردوں میں ہوں جو اپنی من مانی چیز ہر قیمت پر حاصل کرکے رہتے ہیں۔"

"تو میں تم سے مایوس ہو جاؤں؟"

"میں نے تمہیں امید کب دلائی تھی؟"

"اڑے رہوگے اپنی ضد پر؟"

"ضد پر نہیں فیصلہ پر"

مسعود تھوڑی دیر اور بیٹھا رہا۔ پھر وہ اٹھا۔ اس نے کہا۔

"اب چلتا ہوں شاکر!"

"کچھ بگڑے ہوئے سے ہو۔"

"نہیں جی"

"سچ کہنا"

"جھوٹ بولنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"یہ بھی اخلاق میں"

(مسکراکر) "چوٹ کرنے کا کوئی موقع کبھی چھوڑتے بھی ہو تم؟"

"کل بھی آنا۔ تم سے مشورہ کرنا ہے کچھ۔"

"نا بابا! معاف کرو۔ پھر پایا۔"

"ارے، ارے"

"ہاں بھئی! میں کہاں اور مشورہ کہاں؟"

"من خراب کجا و صلاح کار کجا"

"میں اپنا دل چیر کر تمہیں کس طرح دکھاؤں؟"

"ایسی غلطی نہ کر بیٹھنا کہیں"۔

"کیوں؟"

"تم جاؤ پھر"

"کیا بات ہے کچھ کہو تو"

"پھر وہی معاملہ ہوگا"

٥

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا۔ جو چیرا تو اک قطرہ خون نہ نکلا

rekhta

"کیسے کیسے داؤ کرتے ہو تم مسعود!"

"لیکن تم بھی کس کس طرح بچائے جاتے ہو اپنے تئیں قائل ہوں، استاد تمہارا!"

"تم میری جگہ ہوتے تو وہی کرتے، جو میں کر رہا ہوں"

"ہرگز نہیں!"

"پھر کیا کرتے تم؟"

"تم سے بھی دو قدم آگے جاتا۔"

"یعنی؟"

"میں شرعی اجازت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا۔"

"کس طرح؟"

"رضیہ کو بھی اپنے پاس رکھتا، زہرہ کو بھی اپنے پہلو میں بٹھاتا۔ پھر وہ اور زہرہ جبیں (زہرہ کا نام سن کر جی بھرتا نہیں) اور حور شمائل عورتوں سے شادی کر لیتا۔"

"پھر وہی شرارت؟"

"یہ شرارت ہوتی؟ ارے بھئی شرع پر جب عمل کرنے پر آئے، تو پورے طور پر بھی۔"

"تو گویا آپ راجہ اِندر بن جاتے گھر کیا ہوتا پرستان ہوتا!"

"یقیناً! لیکن تمہاری طرح احمق تو نہ ہوتا۔ تم تو اپنے گھر کو جہنم بنانے کے درپے ہو"

"نہ جانے کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں بالکل نہیں سمجھا۔"

"جلد سمجھ جاؤ گے"

"تو مان بھی لونگا"

"پھر ماننا بیکار ہوگا"

"یہ کس لئے؟"

"جہنم میں داخل ہونے کے بعد جنت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔"

"لیکن میں جہنم جانے کیوں لگا؟"

"اچھا جنت ہی۔ لیکن جنت شداد۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ بڑے بدتمیز ہو تم۔"

"ذرا تصور تو کرو۔ تم گھر میں بیٹھے ہو۔ رضیہ بھی موجود ہے اور زہرہ بھی۔ ایک بات رضیہ کو پسند ہے۔ وہی زہرہ کو ناپسند ہے۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ اصرار ہے۔ اب حضور کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اگر زہرہ کا کہا مانتے ہیں تو رضیہ روٹھتی ہے، اور رضیہ کا دل رکھتے ہیں تو زہرہ مرچ بنی جاتی ہے۔"

"لیکن ایسا ہونے ہی کیوں لگا؟"

"دیکھ لینا"

"اجی ابھی سے اس کی کیا فکر؟ جب ہوگا کوئی تدبیر بھی سمجھ میں آجائے گی۔"

ہر چہ آید بر سر اولاد آدم بگذرد!

(مسکرا کر) "یہ فلسفہ بھی ٹھیک ہے"

"ٹھیک؟ اجی اصل فلسفہ حیات ہے یہ"

"قائل ہو گیا میں تمہارے فلسفہ کا۔"

"شکریہ"

"اچھا تو اب رخصت!"

مسعود چلا گیا۔ شاکر کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے اچکن پہنی اور باہر چلا گیا۔

باب ۱۴

بات چیت

کوئی ۱۲ بجے کے قریب کالج میں اطلاع پہنچی کہ رائے بہادر بدری پرشاد کا حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب دفعتاً انتقال ہو گیا۔ وہ ٹرسٹیوں میں بہت محبوب تھے۔
اس خبر کے آتے ہی کالج میں چھٹی ہو گئی۔ اسی وقت یونین ہال میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں رائے بہادر کے تعلیمی خدمات اور کالج کی سرپرستیوں کو سراہا گیا تھا۔ جلسہ کے بعد لوگ منتشر ہو گئے۔ ثریا اور شاہد ساتھ ساتھ سائیکل پر کالج سے باہر نکلے جاتے جاتے دونوں رانی باغ کے پاس پہنچے۔ شاہد نے کہا۔ "چلو ثریا باغ کی سیر کریں۔ کچھ باتیں بھی کرنی ہیں تم سے"۔

دونوں نے اپنی اپنی سائیکل کا رخ باغ کی طرف کر دیا۔ پہلے تو دونوں وہاں کی سیر کرتے رہے پھر ایک کنج کے دامن میں جا کر بیٹھ گئے۔ شاہد درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ ثریا اس طرح دوزانو ہو بیٹھی۔ جیسے مکتب میں ملاجی کے سامنے بچے قاعدہ لے کر

بیٹھتا ہے۔ اس نے اپنی مقناطیسی آنکھوں کو حرکت دی مسکرائی۔ گردن کو خفیف سا جھٹکا دے کر سر ایک طرف کو تھوڑا سا جھکا لیا۔ پھر ایک ادائے خاص کے ساتھ گویا ہوئی۔

"ہاں بھئی اب چھڑے باتوں کا سلسلہ"

ثریا کو اس وضع میں اس رنگ میں دیکھ کر شاہد کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا ثریا کو اٹھا کر آنکھوں میں رکھ لے۔ اس نے کہا۔

"باتوں کے لئے یہ کب ضروری ہے کہ وہ زبان سے ہوں"۔

"اوہو آپ وہ باتیں کرنا چاہتے ہیں جو نگاہ خاموش سے کی جاتی ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

شاہد نے کہا۔

"بھئی سمجھیں تو ٹھیک!"

"داد دیجئے میری ذہانت کی"۔

"تمہاری ذہانت کا تو سارا کالج قائل ہے"۔

"اب آپ آنکھوں کا کام زبان سے لینے لگے یہ بدعہدی ہے"

"جو کام زبان کرتی ہے وہ آنکھیں نہیں کر سکتیں۔ جو کام آنکھوں سے ہو جاتا ہے۔ وہ زبان سے نہیں بن پڑتا۔ آگیا خیال میں جناب ثریا بیگم صاحبہ!"

"ہاں! شاہد یہ تو بتاؤ"

"کیا؟"

"کچھ نہیں۔ شاہد۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا!"

"کچھ کہہ ڈالو۔ کیوں رہ جائے ارمان"

rekhta

"جاؤ نہیں کہتے۔ کوئی زبردستی ہے کسی کی؟"

"نہیں سرکار، زبردستی نہیں۔ عرض۔ التجا۔ گذارش۔ بھلا زبردستی اور آپ سے؟"

"یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے"

"اب آئے راہ پر"

"تو ارشاد فرمائیے نا"

"کیا؟"

"جو کچھ فرمانے کا ارادہ تھا۔"

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ راشن میں شکر کم ملتی ہے۔ اس کا بھی کوئی علاج ہے؟"

یہ کہہ کر وہ مسکرا دی!

"کیوں نہیں ہے علاج!"

"تو بتاؤ نا"

"شکر کا استعمال کم کردو"

دونوں خوب ہنسے۔ کچھ دیر تک خاموشی سی چھائی رہی۔ پھر ثریا نے کہا۔

"ایک خوشخبری سناؤں؟"

"ہاں! ہاں شوق سے۔"

"میری شادی ہونے والی ہے"۔

یہ کہہ کر ثریا تو مسکرانے لگی۔ لیکن شاہد کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کا یہ رنگ دیکھ کر ثریا سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے کہا۔

"کیا بات ہے شاہد؟"

"سچ کہہ رہی ہو ثریا!"

"ہاں ہاں"

"تمہیں خوشی ہے اس سے؟ تم راضی ہو اس شادی سے؟"

"بالکل نہیں۔ شادی تو تم سے ہوگی میری۔ میں تو گھر والوں کی حماقت پر طنز کر رہی تھی۔"

"کہاں سے بات آئی ہے؟ ہوگا کوئی بڑا گھرانا؟"

"ہاں گھرانا تو بڑا ہے۔ مچھیس پور کے رئیس اعظم صاحب خط غلامی لکھنے پر تیار ہیں۔ پوری باتیں تو نہیں سن پائی۔ کچھ بھائی جان اور امی جان میں کانا پھوسی ہو رہی تھی۔ اس سے بھی اندازہ لگایا میں نے۔"

"پھر کیا ہوگا اب؟"

"فکر کا ہے کی؟"

"اور جو کر دی ان لوگوں نے تمہاری شادی رئیس اعظم صاحب سے تو؟"

"شاہد! تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ میں کوئی کھلونا ہوں کہ گھر والے جسے چاہیں مجھے بخش دیں۔ میں راہ دیکھ رہی ہوں کہ یہ لوگ مجھ سے رائے لیتے ہیں یا نہیں۔ اگر انہوں نے رائے لی تو صاف صاف کہہ دوں گی۔ کہ شاہد کے سوا کسی سے میری شادی نہیں ہو سکتی اور اگر نہ لی رائے انہوں نے تو دیکھ لینا کیا تماشہ ہوتا ہے!"

"کیا کرو گی؟"

"ابھی نہیں بتائیں گے۔"

"جو چاہو کرو۔ لیکن اپنے عہد پر قائم رہو گی؟"

"کون سا عہد؟"

"عمید وفا"

"شاہد! عورت کے پہلو میں ایک ہی دل ہوتا ہے۔ وہ ایک ہی بار محبت کرتا ہے اور ایک ہی کا ہو رہتا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ تم رئیس اعظم نہیں ہو۔ تم آئی۔ سی۔ ایس نہیں ہو۔ تم تاجر یا سوداگر نہیں ہو۔ لیکن میرا دل تمہارا ہو چکا۔ تم میری روح کے مالک بن چکے۔ میں تمہارے سوا اب کسی کی نہیں ہو سکتی۔"

"ثریا تمہاری ان باتوں نے مجھے نئی زندگی بخش دی۔ شادی کا لفظ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ لیکن تمہارے استقلال نے مجھے زندہ کر لیا۔ مرنے سے بچا لیا۔ لیکن ایک بات تو بتاؤ۔"

"کیا بات؟"

"اگر تم پر جبر ہوا۔ تم ٹھہریں لڑکی ذات۔ پھر؟"

"ہاں میں لڑکی ہوں۔ لیکن اپنے پہلو میں مضبوط دل رکھتی ہوں۔ مجھے کوئی نہیں جھکا سکتا۔ کوئی نہیں دبا سکتا۔ میں حالات کے مقابلہ کے لئے جو اڑی ہوئی ہوں اس کی وجہ یہی خود اعتمادی ہے۔ ورنہ آسانی سے میں تمہارے ساتھ فرار ہو سکتی تھی۔"

"عجیب چیز ہو ثریا خدا کی قسم تم بھی"

"کیوں؟"

"اس نیچر کی کوئی عورت میری نظر سے آج تک نہیں گذری۔"

"تم! یہ نئی بات معلوم ہوئی جناب کی۔"

"کیا؟"

"آپ خیر سے عورت شناس بھی ہیں۔ کتنی عورتوں سے سابقہ پڑ چکا ہے

آپ کا۔ میں تو حضرت کو ذرا بھولا بھالا سمجھتی تھی۔ مگر نکلے رنگے سیار۔ سچ ہے۔ مردوں کا کوئی اعتبار نہیں۔"

"ثریا تم پاگل بھی ہو۔ الزامات لگانے پر آئیں تو تعزیرات ہند کی ہر دفعہ چسپاں کر دی مجھ پر۔ میں کروں تعریف اور تم اس میں الزام کا پہلو نکال لو۔ کیوں؟"

"تعریف ہی کرتے کرتے تو بگڑ گئے تم۔"

"کیا بات پکڑی تم نے میری۔"

"تم نے میری سی کوئی عورت نہیں دیکھی ہیں؟"

"ٹھیک ہے۔"

"یعنی بہت سی عورتیں دیکھ چکے ہو۔ جو اگرچہ میری سی نہ تھیں۔ لیکن تھیں عورت۔ کیوں شاہد سچ کہہ رہی ہوں یا جھوٹ؟"

"بالکل جھوٹ!"

"مرد کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ اقرار جرم بھی نہیں کرتا بحث کرتا رہتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ شاہد بھی مسکرا دیا۔ سحاب تبسم نے بات آئی گئی کر دی۔ لیکن ثریا تو پنجے جھاڑ کے اس کے پیچھے پڑی تھی۔ اس نے کہا۔

"اس کی سند نہیں بتائیے۔ آپ کو کن کن عورتوں سے واسطہ پڑا ہے؟"

"کسی سے بھی نہیں"

"جائیے۔ ہم نہیں بولتے آپ سے۔"

یہ کہہ کر ثریا شاہد کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی اور سامنے جو پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے انہیں دیکھنے لگی۔

"شاہد نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ روٹھی رہی۔ کہنے لگی۔

"بس دیکھ لیا آپ کو"

"کیا دیکھا تم نے؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔ میں بھی تو سنوں"

"آپ بڑے وہ ہیں"

"پھر ایک نیا معمہ۔ صاف کہو نا"

"گرگ باراں دیدہ!"

اپنے اس جملہ پر ثریا نے قہقہہ لگایا۔ اور شاہد بھی بے اختیار ہنسنے لگا۔ پھر دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔

باب ۱۵

اَن بَن

شاکر نے اب زہرہ کے ہاں آنا جانا بند کر دیا تھا۔ جہاں اس کی یہ پذیرائی ہو وہاں وہ کیوں جائے۔ بار بار اس کا جی چاہتا تھا کہ زہرہ کے کوچۂ ملامت کا طواف کرے لیکن اس کے پندار کا صنم کدہ ابھی آباد تھا۔ بالکل ویران نہیں ہوا تھا۔

زہرہ نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ پہلے اگر کسی وجہ سے ایک روز بھی شاکر نہیں جاتا تھا۔ تو آدمی پر آدمی اور رقعے پر رقعے چلے آتے تھے۔ اب کے پندرہ دن ہو گئے لیکن زہرہ نے خبر بھی نہیں لی۔ جھوٹوں بھی تو نہیں پوچھا۔

وہ پریشان سا اپنے کمرہ میں بیٹھا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اتنے میں مسعود آتا دکھائی دیا۔ شاکر نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ ہاتھ ملایا اور اپنے کمرے میں لے آیا۔ مسعود نے کہا۔ اچھے تو ہو بھئی!

"نہیں کیا؟"

"تم کو آشفتہ نصیبوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا"

"زہرہ سے نہیں تم اپنے ایک دوست سے مخاطب ہو کر شاکر"

یہ کہہ کر مسعود نے مسکراتے ہوئے شاکر کا جائزہ جو لیا تو معلوم ہوا۔ حالت دگرگوں ہے۔ وہی شاکر جو ہنس ہنس کر ہاشم کے وار سہہ رہا تھا۔ جو مردانہ وار مسعود کی گستاخیوں کو برداشت کر رہا تھا۔ آج بے انتہا نڈھال، غمگین اور افسردہ نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسعود نے کہا۔

"شاکر کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں"

"کچھ تو؟ زہرہ سے ان بن ہو گئی۔"

"یہی سمجھ لو"

"کس بات پر؟ کچھ کہو تو سہی۔"

"کہوں کیا روٹھتی ہوتی ہیں۔ بیگم صاحبہ پہلے بھی روٹھا کرتی تھیں۔ لیکن خود بخود من جایا کرتی تھیں۔ لیکن اب کے تو رنگ ہی دوسرا ہے۔"

"کیا رنگ ہے؟"

"بس سمجھ لو ۔۔۔

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
لیکن اب کے سرگرانی اور ہے

"صاف صاف کہو شاکر!"

شاکر نے ابتدا تا انتہا سارا ماجرا سنا دیا۔ مسعود نے کہا۔

"بڑی فیلسوف عورت ہے۔"

"حد سے زیادہ"

"لیکن شاکر! زہرہ میرے دل میں گھر کر رہی ہے۔"

(مسکرا کر) تو بن جاؤ رقیب میرے۔ شاکر میں بھی غالب کی زبان میں کہہ دوں

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔ لیکن تم سے جو باتیں میں نے زہرہ کی سنی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔"

"تمہارا خیال صحیح ہے۔ عجیب کینڈے کی عورت ہے۔ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ باتیں ایسی چچی تلی کرتی ہے کہ کوئی جواب نہ بن پڑے۔"

"محبت تو ایثار کا دوسرا نام ہی ہے۔ کر ڈالو قربانی"

"کیا مطلب؟"

"جو وہ کہتی ہے مان لو۔"

"پاگل ہوئے ہو۔ ایک لاکھ مہر پہ ایسی تیکھی اور متلون مزاج عورت سے شادی کر لوں۔ اس کے بھائی سے اپنی بہن کو بیاہ دوں؟"

"یہ مضائقہ کیا ہے اس میں؟"

"یہ لیجیے کچھ مضائقہ ہی نہیں!"

"میرے خیال میں تو نہیں ہے!"

"کیسے نہیں ہے۔ مہر میں ایک لاکھ نہیں دس لاکھ کا باندھ لوں۔ لیکن ثریا کی شادی شاہد سے نہیں کر سکتا ہوں۔"

"کیوں"

"دنیا کیا کہے گی مجھے؟ امی جان کو کس طرح سمجھاؤں گا میں؟ میں ذات پات کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔ لیکن آبرو باختہ لڑکی سے میں اپنی بہن کا دامن نہیں باندھ سکتا۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"ابھی تو سوچ رہا تھا۔"

"اچھا ایک کام کرو"

"وہ کیا؟"

"ثریا کا عندیہ لو۔"

"ارے بھائی عندیہ تو جب لوں۔ جب میں اس رشتہ کو پسند کر دوں۔ پھر اس کا رشتہ نواب زادہ رشید محمود سے طے پا چکا ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے؟"

"اور کیا؟"

"تو ٹھہاؤ زہرہ کے خیال کو۔"

"یہ بھی مشکل ہے"

"تو جاؤ اس کے گھر ہاتھ باندھ کر مانگ رساؤ"

"اس کا یہ تغافل دیکھ کر اس کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔ اس سے یہ بھی بعید نہیں کہ ملنے سے انکار کر دے۔ یہ میری بڑی ناقابلِ برداشت توہین ہوگی۔"

"تو تھوڑا سا زہر کھا لو۔"

"یہی ارادہ ہے۔"

"تم بزدل ہو۔ ایسا نہیں کر سکو گے۔"

"دیکھ لینا"

"اچھی بات ہے۔ دیکھ لیں گے ہم بھی۔"

"یار زندہ صحبت باقی"

شاکر کچھ جواب دینے کو تھا کہ مولوی متین الزماں صاحب کمرہ میں السلام علیکم کا نعرہ لگاتے ہوئے داخل ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی دونوں چپ ہو گئے۔ یہ انجمن تنظیم المسلمین کے ناظم تھے۔ شاکر سے ان کی پرانی یاد اللہ تھی۔ بڑے مخلص اور شریف آدمی تھے یہ۔

مولوی صاحب کے آتے ہی گفتگو کا رنگ بدل گیا۔ موسم سے شروع ہوا اور سیاسیات عالم پر پہنچ گیا۔

باب ۱۶

ردِّ عمل

مسعود کی گفتگو سے ہاشم اتنا متاثر ہوا۔ کہ اس نے یقین کر لیا رضیہ میری نہیں ہو سکتی۔ "وہ مجھے نہیں چاہتی۔ میں اسے نہیں پا سکتا۔"

اب اس کا وہ جوش و خروش ختم ہو چکا تھا۔ ولولۂ عشق سرد پڑ گیا تھا۔ پہلے سے وہ خرم نہیں رہتے تھے۔ اب وہ بجھا بجھا سا رہتا تھا۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

گھر میں بھی وہ بہت کم آتا تھا اور رضیہ سے ملنا جلنا تو اس نے گویا یک لخت ترک کر دیا تھا۔ دوسرے تیسرے کہیں مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں کی باتیں ہوئیں بھی تو رسمی۔

ایک روز رضیہ نے دیکھا ہاشم کا سامان بندھ رہا ہے۔ معلوم ہوا کہیں باہر جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس نے دریافت کرنا چاہا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے۔ وہ کتنے دن

کے لئے جا رہا ہے؟ لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی۔ سامنے دو قدم پر ہاشم کا کمرہ تھا۔ وہ وہاں جانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے پاؤں اٹھ نہیں رہے تھے۔

اتنے میں ہاشم یاس اور افسردگی کا پیکر بنا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ رضیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے کہا۔

"ہاشم!"

"فرمائیے!"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"جہنم میں ——— چلو گی میرے ساتھ؟"

رضیہ شاید کچھ کہتی۔ لیکن ہاشم جواب کا انتظار کئے بغیر چلا گیا۔

ہاشم کی جائیداد کا انتظام ایک منشی جی کے سپرد تھا۔ وہ اسے اسٹیشن تک پہنچانے گئے۔ واپس آئے تو رضیہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "وہ دہلی گئے ہیں۔ دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور تاکید کر گئے ہیں۔ جتنا روپیہ منگاؤں تار سے بھیجنا۔ ہونہ۔ صاحبزادے کو یہ ٹھاٹھ سوجھے ہیں اور یہاں جائیداد کا کام چوپٹ ہوا جا رہا ہے۔" یہ کہہ کر منشی جی رجسٹروں کی تلاوت کرنے لگے اور رضیہ چپ چاپ اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ مایوسی نے ہاشم کو حواس باختہ کر دیا ہے۔ اب وہ اپنے تئیں تباہ و برباد کرنے پر تل گیا ہے۔ ورنہ وہ یہ دس ہزار روپیہ کیوں لے گیا؟

رضیہ پھر منشی جی کے پاس آتی کہنے لگی۔

"کچھ بتا گئے ہیں کب آئیں گے؟"

"میں نے پوچھا تو کہنے لگے تمہیں کیا؟ خوب مزے کرنا میرے پیچھے!"

rekhta

رضیہ سنتی رہی۔ منشی جی پھر گویا ہوئے۔

"وہ اور سنو میں مرے گرو نگا۔ سات پشتیں گذر گئیں اس گھر میں۔ مگر صاحبزادے مجھے اب تک سمجھے ہی نہیں۔ ماں بھی۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ بھائی نہ بہن۔ تن تنہا وارث۔ اتنی بڑی جائداد۔ وہ مرے نہیں کرینگے۔ تو ہم کرینگے۔ اس بڑھاپے میں؟"

یہ کہکر منشی جی پھر رجسٹروں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ رضیہ کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ جیسے۔ لبالب جام۔

وہ پھر اپنے کمرہ میں واپس آگئی۔ ایک آرام کرسی پڑی تھی۔ اسی پر دراز ہوگئی۔ بچپن کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ اس کے سامنے محسوس اور مرئی صورت میں جلوہ گر ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو چھلکنے لگے۔ آرام کرسی سے وہ میز پر آبیٹھی۔ سامنے قلم دوات اور چند پیپر رکھا تھا۔ وہ ہاشم کو خط لکھنے لگی۔ اس نے لکھا۔

"ہاشم!

تم روٹھ کر چلے گئے۔ تم اس سے روٹھ گئے جس سے قسمت بھی روٹھی ہوئی ہے۔ اس گھر میں ایک تم تھے۔ جس سے دل شکستہ کو کچھ تسکین ملتی تھی۔ تمہارے جاتے ہی پھر وہی غم اور یاس کی گھٹائیں چھانے لگیں۔ جنہوں نے میری زندگی کے سورج کو ڈھانپ رکھا تھا۔

تم مرد ہو۔ کس مزے میں دس ہزار روپے جیب میں ڈالے اور غم غلط کرنے پہاڑ کی سیر کو چلے گئے۔ میں عورت ہوں۔ ہندوستان کی عورت میری ذمہ داریاں تم سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ میں کہیں نہیں جاسکتی۔ میں کس طرح اپنا غم غلط نہیں کرسکتی۔

میں تمہاری دلہن بن سکی نہ شاکر میرا دولہا بن سکا۔ ہم دونوں کا غم مشترک ہے۔ اس سے

بڑھ کر دوستی کی بنیاد کیا ہوسکتی تھی؟

تو ہائے گل پکاروں میں چلاؤں ہائے دل

لیکن تم نے میری دوستی ٹھکرادی۔ بھولپن میں بچکونے کی طرح تنہا چھوڑ گئے۔ تم سے یہ امید نہ تھی۔ لیکن امید کا ذکر ہی کیا ہے

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

میرا جی چاہتا ہے کہ تم سے التجا کروں۔ واپس آجاؤ۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ وہی محبت جو ایک دوست کو دوست سے ہوتی ہے۔ اب اس دنیا میں ہم ایک دوسرے کے صرف سچے دوست بن سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ شادی بیاہ۔ میاں بیوی یہ رشتے ہیں۔ رشتوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ محبت پر مبنی ہوں۔ محبت پر مبنی نہ ہوں تو بھی وہ نہیں ٹوٹتے۔ البتہ محبت کو توڑ ڈالتے ہیں۔ چکناچور کردیتے ہیں۔ لیکن دوستی ان سب پر بالا ہے۔ ہم تم شادی بیاہ کے رشتہ میں منسلک نہ ہوسکے۔ میاں بیوی نہ بن سکے۔ لیکن ہماری دوستی پھر بھی قائم رہ سکتی تھی۔ مگر تم نے مجھ کو دوری کی یہ آگ بھی بخش دی۔

ہم تم بچپن کے ساتھی تھے۔ بے تکلفی کے دامن میں پلے بڑھے۔ اس بے تکلفی نے ہماری بے لوث محبت کو اور جلا دے دی ہاشم! محبت وہی ہے جو بے لوث ہو۔ اصل محبت یہی ہے۔ حاصل محبت یہی ہے۔ اس حد سے آگے میں کسی طرح نہیں جاسکتی

ثریا بڑی پیاری لڑکی ہے۔ اس لئے چاہا تھا۔ وہ تمہاری رفیقۂ زندگی بن جائے۔ لیکن تم شاکر سے بھی جاکر روٹھ گئے۔ بالکل یہیں کے تم آجاؤ۔ میں تمہیں وہ پھر دونگی۔

جس کی آب سے تمہارا خانۂ دل جگمگانے لگے گا۔ جس کی تابش سے دل کی اندھیری بستی روشن ہو جائے گی۔ جسے پا کر تم وہ سب کچھ پا لوگے جس کی آرزو ایک مرد کر سکتا ہے۔"

رضیہ نے یہ خط لکھا۔ اسے ایک دفعہ پھر پڑھا۔ لفافہ میں بند کیا۔ سیدھی منشی جی کے پاس گئی۔

"آپ کو پتہ معلوم ہے ان کا؟"

"ہاں لکھا تو گئے ہیں کوئی ہوٹل ہے۔"

"یہ خط بھی انہیں بھیج دیجئے۔"

منشی جی نے لفافہ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ ہاشم کا نام رضیہ نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ باقی پتہ منشی جی نے لکھا اور ٹکٹ لگا کر ڈاک خانہ میں ڈال آئے۔

باب ۱۷

زندگی کا نیا دور

ہاشم نے رضیہ کے خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ رضیہ کو اس کی یاد کو اپنے جذبۂ محبت کو فراموش کر دینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ دنیا کی ہر ایک چیز کو بھول جائے۔ اس نے رضیہ کا خط پڑھا۔ مسکرایا۔ اس کے پرزے پرزے کئے اور پھینک دیئے۔ جیسے وہ پرزے ہوا میں۔ یہ کاغذ کے پرزے نہیں ہاشم کے دل کے ٹکڑے تھے۔

مگر انڈیا ہوٹل میں وہ مقیم تھا۔ بہت جلد وہ جدلنگ کے قافلوں میں وہ گھل مل گیا۔ یورپین اینگلو انڈین، بنگالی، غیر ملکی، ہر سوسائٹی میں اس کی پہنچ تھی۔ ہر جگہ وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ انگریزی انگریزوں کی طرح بولتا تھا۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ جس سوسائٹی میں پہنچ جاتا جان محفل بن جاتا۔

لیکن بہت جلد وہ ان آدمیوں سے اس کی طبیعت اکتا گئی۔ رضیہ کی یاد نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ اس کی محبت سے بغاوت کرنا چاہتا تھا۔ مگر کامیاب نہیں ہو پاتا تھا۔

اس نے گرانڈ ہوٹل کا قیام ترک کر دیا۔ آبادی سے ذرا فاصلہ پر ایک اور ہوٹل تھا۔ وہ یہاں اٹھ آیا۔ یہاں زیادہ تر وہ مسافر ٹھہرتے تھے جو تماشبین قسم کے ہوتے تھے۔ عیاشی جن کا چلن ہوتا تھا۔ جو پانی کی طرح روپیہ بہاتے تھے۔

ایک روز وہ ہوٹل سے باہر نکلا۔ ارادہ تھا ذرا چہل قدمی کر آئے۔ پاس سے ایک آدمی گزرا۔ اس نے ہاشم کو مخاطب کئے بغیر پوچھا۔

"دل بہلاؤ گے بابو جی!"

ہاشم کا دل عرصے سے بہل نہیں رہا تھا۔ وہ اسے واقعی بہلانا چاہتا تھا۔ وہ رک گیا۔ اس نے کہا۔

"ہاں! معلوم ہے تمہیں کوئی نسخہ؟"

"بڑا اچھا نسخہ ہے بابو جی!"

"کیا ہے وہ!"

"ایک چھوکری ہے سرکار۔ بڑی سندر۔ بڑی مدھر۔ بڑی چنچل"

"کہاں ہے وہ؟"

"چلئے میرے ساتھ۔"

ہاشم اس کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں چلتے رہے۔ ایک مکان کے پاس پہنچے۔ اس آدمی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بڑھیا باہر نکلی۔ اس نے آغوش شوق کی طرح دروازہ کھول دیا۔ دونوں اندر گئے۔ سامنے ایک کمرہ تھا سجا ہوا۔ بارونق۔ ایک ۱۶-۱۷ برس کی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ کٹیلی۔ چھبیلی۔ گٹھا ہوا بدن۔ سانولا زردی مائل رنگ۔ ناک نقشہ دیدہ زیب۔ چہرہ پر بچپن۔ کمر میں لوچ۔ باتوں میں جادو۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ بڑے بڑے بال۔ وہ ایک ادا سے جان

ناز کے ساتھ اپنی قاتل آنکھوں سے زہر ہلاہل برساتی آگے بڑھی۔

"آئیے!"

یہ کہہ کر اس نے ہاشم کا ہاتھ پکڑ کر ایک زرنگار پلنگ پر گاؤ تکیہ کے پاس بٹھلا دیا۔ اور خود بھی ایک ادائے جاں ستاں کے ساتھ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

ہاشم نے مقررہ فیس اس آدمی کے حوالے کی۔ وہ رقم لے کر باہر نکلا۔ اس نے دروازہ بھیڑا۔ پھر ایک ادا کے ساتھ جو شراب انگوری سے بھی زیادہ نشہ آور تھی ——— اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ ناگن کی طرح بل کھاتی۔ اپنے خرام ناز سے فتنۂ محشر کو جگاتی آئی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ وہ اس کے اور قریب آ گئی۔

بولی:—

"بابو جی!"

ہاشم اب بھی خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اٹھی۔ اس نے الماری کھولی۔ مئے دو آتشہ کے دو جام بھرے۔ انہیں ٹرے میں لگا کر لائی۔ ایک گلاس اپنے منہ سے لگا لیا۔ دوسرا ہاشم کی طرف بڑھا دیا۔ دونوں نے جلدی ہی اپنے اپنے گلاس خالی کر دیئے۔ اب تو دور شروع ہو گیا۔ کملا کی آنکھوں سے جذبات کا دریا ابل رہا تھا۔ دونوں مسکرائے۔ بغل گیر ہوئے اور اس طرح گھل مل گئے جیسے پرانے عاشق اور معشوق۔ مستقبل کی فکر سے دونوں بے نیاز تھے۔ کل کیا ہوگا؟ اسے کوئی نہیں سوچ رہا تھا۔ آج جو کچھ ہے وہی دونوں کا مرکز توجہ تھا۔ رات بھر دونو ایک کمرے میں رہے۔ ان چند گھنٹوں کے اندر محبت کا پودا ابھرا۔ بڑھا۔ بار آور ہوا۔ اور صبح ہوتے ہوتے مرجھانے لگا۔

صبح ہوئی۔ ہاشم نے کپڑے پہنے۔ باہر جانے کے ارادہ سے اٹھا۔ کملا اس کے پاس کھڑی

تھی ۔ دونوں کا نشہ اتر چلا تھا ۔ لیکن دونوں کو رات کی رنگینیاں اور عیش کوشیاں یاد تھیں ۔ جاتے ہوئے ہاشم نے کملا کی طرف دیکھا کملا نے پوچھا ۔ آج بھی آؤ گے بابو جی ! ہاشم مسکرایا اس نے ہاں کہا اور سو روپیہ کا ایک نوٹ کملا کے ہاتھ میں رکھ دیا ۔

ہاشم چلا گیا ۔ سو روپیہ کا نوٹ دیکھ کر کملا سوچ میں پڑ گئی ۔ پہاڑوں پر حسن کی جنس عام ہے ۔ اقتصادیات کا مشہور مسئلہ طلب و رسد وہاں بھی کارفرما ہے ۔ طلب سے رسد زیادہ ہے اس لئے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں وہاں حسن بہت سستا بکتا ہے ۔ بمبئی میں ایک بدصورت چھپکلی ایک آدمی سے دس روپے اینٹھ لے گی اور پندرہ منٹ بعد اسے چلتا کر دے گی ۔ کشمیر کا حسن مجبوراً رات بھر آپ کی پذیرائی کرے گا ۔ اور پانچ روپیہ پر قناعت کرے گا ۔ آج تک سو روپیہ کا انعام کبھی کملا کو نہیں ملا تھا ۔ دوسرے تماشبین اگر بہت خوش ہوتے تو چلتے وقت روپیہ آٹھ آنے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے ۔ یہ پہلا تماشائی تھا جس نے ایک دم سو روپیہ کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا اور بے پروائی سے چلا گیا تھا ۔

وہ سوچنے لگی ۔ اس روپیہ کو رامو سے اور اس کی ماں کوشلیا سے کیونکر چھپاؤں ؟ فیس ان کا حق ہے ۔ وہ انہوں نے لے لی ۔ انعام اور بخشش میرا حق ہے ۔ یہ کیوں ان کے قبضے میں جائے ۔ اس نے نوٹ کو ساڑھی کے ایک پلو میں باندھا ۔ اور پیٹ کے پاس اڑس لیا ۔

تھوڑی دیر کے بعد رامو آیا ۔ "بخشش کیا دی بابو نے تجھے ؟"

کملا نے کہا کچھ نہیں ۔ نہ جانے کس پاگل کو لے آئے تم ۔ رات بھر شراب پیتا رہا ۔ پیتے پیتے بے ہوش ہو گیا ۔ صبح ہوتے ہی کپڑے پہنے اور چلا گیا ۔

"پھر آنے کو کہہ گیا ہے ؟"

"ہاں کہا تو ہے پھر آنے کو ۔"

"خیال رکھنا اس کا ۔ موٹا آسامی ہے ۔ پچاس روپے دیئے تھے اس نے فیس کے پچاس روپے ۔"

یہ سن کر اور کملا کے کان کھڑے ہوئے ۔ ساتھ ہی فیس کملا کی عصمت فروشی کی تاریخ کا بالکل پہلا واقعہ تھا ۔

رامو چلا گیا ۔ لیکن کملا سوچنے لگی ۔ کون تھا یہ آدمی ۔ کیوں لٹائے دے رہا ہے اپنی دولت ؟ کیا ہوا ہے اسے ؟ کچھ سودائی سے دکھائی پڑتے ہیں یہ حضرت !

یہی سوچتے سوچتے اس کا تصور ماضی کی دنیا میں پہنچ گیا ۔ جب وہ ایک اندھیری رات کو تالاب کے کنارے اپنے بچپن کے جگدیش سے پیار اور پریم کی باتیں کر رہی تھی ۔ جب معصومیت کی بنیاد پر مستقبل کے قلعے تیار کئے جا رہے تھے ۔ جب نوکری کے آغوش میں ان دونوں کی محبت پروان چڑھ رہی تھی ۔ جب جگدیش اس سے کہہ رہا تھا ۔ کل میں جا رہا ہوں شہر ۔ اب سال بھر بعد لوٹوں گا انٹرنس کا امتحان پاس کر کے ۔ اور اس نے جواب دیا تھا ۔ جاؤ ۔ میں بھی پڑھنے لکھنے میں بڑی محنت کر رہی ہوں ۔ تمہارے آتے آتے میں بھی انگریزی اتنی سیکھ لوں گی کہ فر فر تم سے باتیں کروں گی ۔ تمہیں پڑھی لکھی بیوی پسند ہے نا ؟ جگدیش یہ سن کر مسکرا دیا تھا ۔ اس نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا تھا ۔ اور بے ساختہ پیار کر لیا تھا ۔

پھر جگدیش شہر چلا گیا ۔ وہ پنڈت جی سے اور گاؤں کے ماسٹر جی سے انگریزی پڑھتی رہی ۔ اچھی خاصی ترقی کر رہی تھی وہ ۔ اب سال پورا ہونے کو تھا ۔ جگدیش اس کے دل کا راجہ واپس آنے کو تھا ۔ وہ خوش خوش رہتی تھی ۔ نہ جانے کیوں جگدیش کا تصور کرتے ہی اس کے دل کا پھول کھل اٹھتا تھا ۔ اس کے چہرہ پر سرخی دوڑ جاتی تھی ۔

پھر گاؤں میں ڈاکہ پڑا ۔ اس کا باپ گاؤں کا کھاتا پیتا آدمی تھا ۔ ڈاکوؤں نے سبھی کے گھر

"خیال رکھنا اس کا۔ موٹا آسامی ہے۔ پچاس روپے دیتے تھے اس نے فیس کے پچاس روپئے"۔

یہ سن کر اور کملا کے کان کھڑے ہوئے۔ اتنی بڑی فیس۔ کملا کی عصمت فروشی کی تاریخ کا بالکل پہلا واقعہ تھا۔

رامو چلا گیا۔ لیکن کملا سوچنے لگی۔ کون تھا یہ آدمی۔ کیوں لٹائے دے رہا ہے اپنی دولت۔ کیا ہوا ہے اسے؟ کچھ سودائی سے دکھائی پڑتے ہیں یہ حضرت!

یہی سوچتے سوچتے اس کا تصور ماضی کی دنیا میں پہنچ گیا۔ جب وہ ایک اندھیری رات کو تالاب کے کنارے اپنے بچپن کے جگدیش سے پیار اور پریم کی باتیں کر رہی تھی۔ جب معصومیت کی بنیاد پر مستقبل کے قلعے تیار کئے جا رہے تھے۔ جب بے فکری کے آغوش میں ان دونوں کی محبت پروان چڑھ رہی تھی۔ جب جگدیش اس سے کہہ رہا تھا۔ کل میں جا رہا ہوں شہر۔ اب سال بھر بعد لوٹوں گا انٹرنس کا امتحان پاس کر کے۔ اور اس نے جواب دیا تھا۔ جاؤ۔ میں بھی پڑھنے لکھنے میں بڑی محنت کر رہی ہوں۔ تمہارے آتے آتے میں بھی انگریزی اتنی سیکھ لوں گی کہ فر فر تم سے باتیں کروں گی۔ تمہیں پڑھی لکھی بیوی لینی ہے نا؟ جگدیش یہ سن کر مسکرا دیا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا تھا۔ اور بے ساختہ پیار کر لیا تھا۔

پھر جگدیش شہر چلا گیا۔ وہ اپنے چاچی سے اور گاؤں کے ماسٹر جی سے انگریزی پڑھتی رہی۔ اچھی خاصی ترقی کر رہی تھی وہ۔ اب سال پورا ہونے کو تھا۔ جگدیش اس کے دل کا راجہ واپس آنے کو تھا۔ وہ خوش خوش رہتی تھی۔ نہ جانے کیوں جگدیش کا تصور کرتے ہی اس کے دل کا پھول کھل اٹھتا تھا۔ اس کے چہرہ پر سرخی دوڑ جاتی تھی۔

پھر گاؤں میں ڈاکہ پڑا۔ اس کا باپ گاؤں کا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ ڈاکوؤں نے سبھی کے گھر

کو تو لوٹا۔ اس کی شادی بیاہ کے لئے جو زیور کپڑے تھے وہ لئے۔ جو زر نقد تھا۔ اس پر قبضہ کیا۔ چلتے چلتے ڈاکوؤں کے سردار نے اپنے ساتھیوں سے کملا کی طرف دیکھ کر کہا "اور یہ مال نہیں چھوڑ دو گے"۔ ڈاکوؤں نے ماں سے بے بس کر دیا۔ اس کے باپ کو مارتے مارتے بے حال کر دیا۔ اس کے بھائی کو اتنا مارا کہ وہ نیم جان ہو گیا۔ اور زر و زیور کے ساتھ اسے بھی منہ میں کپڑا ٹھونس کر لیتے گئے۔

سب سے پہلے سردار نے اس پر ہاتھ صاف کیا اور کرتار ا چھ مہینے کے بعد ایک گاہک سے کچھ روپے لے کر اس نے اسے فروخت کر دیا۔ وہ اسی طرح مختلف جگہوں پر بکتی بکاتی دادھنگ پہنچی۔ یہاں رامو نے پہلے سے اپنی داشتہ بنایا۔ پھر رنڈی عام کر دیا۔ اب وہ رامو کی کنیز تھی۔ وہ گاہکوں کو ڈھونڈھ کر لاتا تھا۔ فیس باہر ہی باہر وصول کر لیتا تھا اور وہ رات بھر رامو کے لائے ہوئے گاہکوں کا جی بہلایا کرتی تھی۔

گاہک بھی بھانت بھانت کے ہوتے تھے۔ کوئی کالا جیسے توے کی سیاہی کوئی موٹا گدے کی طرح۔ کسی کے منہ سے شراب کی بو آتی تھی۔ کسی کی باتوں سے سر پر گند چلتے تھے۔ کوئی امراض خبیثہ کا شکار ہوتا تھا۔ کوئی دق کا مریض۔ کوئی شرابی ہوتا تھا۔ کوئی گوشت خور کوئی بوڑھا ہوتا تھا کوئی جوان۔ وہ سب کی سیوا کرتی تھی۔ سب سے ہنستی بولتی تھی۔ سب کے پہلو میں بیٹھتی اور ناز و غمزہ کا جال پھینکتی تھی۔ سب کی زینت آغوش بنتی تھی۔ سب کی دلبستگی اور اہمیت کا نشانہ بنتی تھی ہنستی ہوئی مسکراتی ہوئی وہ اپنی سب سے قیمتی چیز فروخت کرتی تھی۔ لیکن قیمت سے بھی محروم رہتی تھی۔ پھر بھی اسے خوش رہنا پڑتا تھا۔ بڑی دیر تک وہ یہی باتیں سوچتی رہی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

وہ اپنے باپ کو۔ بھائی کو۔ ماں کو۔ بہن کو حتیٰ کہ جگدیش تک کو بھول چکی تھی۔ اب وہ

کرتا تھا۔ اس کی شادی بیاہ کے لئے جو زیور کپڑے تھے وہ لئے۔ جو زر نقد تھا۔ اس پر قبضہ کیا۔ چلتے چلتے ڈاکوؤں کے سردار نے اپنے ساتھیوں سے کملا کی طرف دیکھ کر کہا: "اور یہ مال نہیں چھوڑ جانا ہے" ڈاکوؤں نے اسے بے بس کر دیا۔ اس کے باپ کو مارتے مارتے بے حال کر دیا۔ اس کے بھائی کو اتنا مارا کہ وہ نیم جان ہو گیا۔ اور زر و زیور کے ساتھ اسے بھی حصہ میں آئی ہوئی جنس کر لیتے گئے۔

سب سے پہلے سردار نے اس پر ہاتھ صاف کیا اور کئی بار چھ مہینے کے بعد ایک گاہک سے کچھ روپے لے کر اس نے اسے فروخت کر دیا۔ وہ اسی طرح مختلف جگہوں پر گھومتی بکتی دارجلنگ پہنچی۔ یہاں رامو نے پہلے اسے اپنی داشتہ بنایا۔ پھر وقف عام کر دیا۔ اب وہ رامو کی کنیز تھی۔ وہ گاہکوں کو ڈھونڈھ کر لاتا تھا۔ فیس باہر ہی باہر وصول کر لیتا تھا اور وہ رات بھر رامو کے لائے ہوئے گاہکوں کا جی بہلایا کرتی تھی۔

گاہک بھی بھانت بھانت کے ہوتے تھے۔ کوئی کالا جیسے توے کی سیاہی کوئی موٹا گدے کی طرح۔ کسی کے منہ سے شراب کی بو آتی تھی۔ کسی کی باتوں سے سر پر مگدر چلتے تھے۔ کوئی امراض خبیثہ کا شکار ہوتا تھا۔ کوئی دق کا مریض۔ کوئی شرابی ہوتا تھا۔ کوئی گوشت خور کوئی بوڑھا ہوتا تھا کوئی جوان۔ وہ سب کی سیوا کرتی تھی۔ سب سے ہنستی بولتی تھی۔ سب کے پہلو میں بیٹھتی اور ناز و غمزہ کا جال پھینکتی تھی۔ سب کی زینت آغوش بنتی تھی۔ سب کی درندگی اور بہیمیت کا نشانہ بنتی تھی ہنستی ہوئی مسکراتی ہوئی وہ اپنی سب سے قیمتی چیز فروخت کرتی تھی۔ لیکن قیمت سے بھی محروم رہتی تھی۔ پھر بھی اسے خوش رہنا پڑتا تھا۔ بڑی دیر تک وہ یہی باتیں سوچتی رہی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

وہ اپنے باپ کو۔ بھائی کو۔ ماں کو۔ بہن کو حتیٰ کہ جگدیش چند کو بھول چکی تھی۔ اب وہ

اس کے کام کی نہیں رہی تھی۔ اسے یقین تھا۔ اگر وہ ان کے پاس پہنچ جاتی تو بھی وہ اسے گھر میں گھسنے نہیں دیتے۔ بات کرنے کے روادار نہیں ہوں گے۔ ان سب کو بھول کر اپنے جسم کو روزانہ بیچ کر وہ ایک خود فراموشی کا سکون سا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن آج ہاشم نے اس کے دل کے تار چھیڑ دیئے تھے۔ اس کے دل کی دنیا پھر تہ و بالا ہونے لگی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ اس آدمی کی طرف دل کھنچتا ہے۔ یہ میرے دل میں سما جانا چاہتا ہے۔ اسے کسی کی پروا نہیں۔ سب سے مستغنی نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی یہ حالت دیکھ کر بھی اس سے نفرت نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے اسے ٹٹولوں۔ دیکھوں یہ کون ہے؟ کیا ہے۔ لیکن یہ سب کیوں کروں؟ کون ہے یہ میرا۔ ایسے ایسے گاہک روز آتے ہیں۔ پیسے دیتے ہیں۔ سودا کرتے ہیں۔ اور چلے جاتے ہیں۔ میں ان جھمیلوں میں کیوں پڑوں؟ میرے لئے سب برابر ہیں۔ میں کسی کی نہیں بن سکتی۔ کوئی میرا نہیں ہو سکتا۔ میری دنیا اور ہے۔ اور یہ تماشبین دوسری دنیا کے رہنے والے ہیں۔ ہم ان کے ہاتھ میں کھلونے کی طرح ہیں۔ جب جی بھر جائے گا۔ اٹھا کر طاق میں رکھ دیں گے۔ یا بے پروائی سے پھینک دیں گے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ ایسے لوگوں کی فکر کیا؟ ایسے لوگوں کا دھیان کیوں۔ ایسے لوگوں کا خیال کس لئے؟

نہ جانے کب تک وہ سوچتی رہی یہی باتیں۔ اتنے میں کوشلیا رامو کی ماں۔ کھانا لے کر آ گئی۔

کرو زہر مار۔ رانی جی!

کملا ایک معمول کی طرح اس بھری آواز سے چونکی اور کوشلیا کا لایا ہوا کھانا زہر مار کرنے لگی۔ ایک پیالہ میں دلی ہوئی دال۔ دوسرے میں ترکاری۔ ایک پلیٹ میں تھوڑے سے چاول دو روٹیاں یہ تھا دستر خوان کملا کا۔ جو اس گھر کی اکیلی کماؤ لڑکی تھی۔ جس کے دم سے رامو چور سے شاہ بن گیا تھا۔ جو اپنی کمائی سے رامو اور کوشلیا کا پیٹ پال رہی تھی۔ وہ نہ ہوتی۔ تو کوشلیا

کسی گھر کے برتن دھو رہی ہوتی۔ اور دھمو جیل میں چکی پیس رہا ہوتا۔ اسی کی کمائی پر یہ خاندان جی رہا تھا۔

باب ۱۸

ترکِ محبت

منصور نے شاکر سے تو ہار نہیں مانی۔ لیکن رضیہ نے اسے شکست فاش دے دی۔ اس نے بار بار اس کی گردن میں اپنی محبت کا پھندا ڈالا۔ لیکن ہر مرتبہ وہ آہوئے وحشی کی طرح چھلانگیں مارتی ہوئی نکل گئی۔ آخر تھک کر اس نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اس دنیا میں جو لوگ عاشق ہوتے ہیں وہ عشق کے لئے جیتے اور عشق کے لئے مرتے ہیں۔ شب فرقت ان کے لئے شب بلا بن کر نمودار ہوتی ہے۔ یوم وصال ان کے لئے عید سعید سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ محبوب کی نگاہ کرم انہیں لطف و مسرت کے ایک نئے عالم میں پہنچا دیتی ہے اور اس کی بے رخی انہیں وقف یاس و حرماں کر دیتی ہے۔ محبوب جھڑکتا ہے، وہ خوش ہوتے ہیں۔ محبوب بات کرتا ہے وہ پھول کی طرح کھل جاتے ہیں۔ ہماری ساری شاعری محبوب کی اپنی نیرنگیوں سے اور عاشق صادق کی اپنی جانبازیوں سے بھری پڑی ہے۔ ہمارے روزمرہ کے مشاہدات اِن حقائق کے آئینہ دار ہیں۔ ایک کامیاب عاشق کے بند قبا فرط مسرت سے ہمیشہ ٹوٹتے رہتے

ہیں۔ اس کی باچھیں ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔ اس کے بالکل برعکس عاشق ناکام ہر وقت، غم زدہ فغاں سے در و دیوار میں زلزلہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس کے رُخ کی زردی، اس کی شب زندہ داری اس کی عزلت پسندی، اس کی رقت قلب اس کا ہول دل ایک ایسا عام سانحہ ہے جو ہر وقت دیکھا جا سکتا ہے۔

لیکن منصور؟ توبہ کیجئے۔ وہ ناکامی اور کامیابی سے اثر لینے کا عادی ہی نہیں تھا۔ وہ کوشش کرتا تھا صرف کوشش۔ اگر کامیاب ہو گیا تو کھلکھلاتا نہیں تھا۔ قہقہے نہیں لگاتا تھا اگر ناکام ہوا۔ تو نہ خودکشی کا خیال اس کے دل میں آتا تھا۔ نہ جنگل اور صحرا کا راستہ ڈھونڈتا تھا۔

وہ یک طرفہ محبت کا قائل نہیں تھا۔ اس نے دیکھا۔ اس کا دل رضیہ کی طرف کھنچتا ہے۔ وہ رضیہ سے یہ سوچ کر زیادہ شدید محبت کرنے لگا۔ کہ وہ بھی اسے چاہنے لگے گی۔ اس کا خیال تھا۔ وہ حق پر ہے۔ رضیہ کا فرض ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے۔ اور اس سے محبت کرنے لگے۔ لیکن رضیہ نے محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا۔

منصور نے دام بچھائے۔ کمندیں پھینکیں۔ کوششیں کیں۔ لیکن رضیہ کو قائل نہ کر سکا۔ اس مایوسی اور ناکامی سے وہ ذرا بھی دل برداشتہ نہیں ہوا۔ وہ اب بھی ویسا ہی خوش۔ ویسا ہی مسرور۔ اور ویسا ہی ہشاش بشاش تھا۔ جیسا پہلے۔ اب تو وہ رضیہ کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

عجیب چیز ہیں ہماری بھابی بھی۔ محبت کا جواب نفرت سے دیتی ہیں اور نفرت کے جواب میں سر تسلیم خم کر دیتی ہیں۔

یہ طنز کر کے وہ خود ہی نکتہ رسی کی داد دیتا اور اس زور کا قہقہہ لگاتا کہ رضیہ سہم جاتی اور گھبرا گھبرا کر اس کی طرف دیکھنے لگتی۔

ہاشم کے دار جلانے کے بعد وہ گھر جسے وہ گوشۂ عافیت سمجھتی تھی۔ اسے ویران اور سنسان۔ دکھی اور بیمار۔ افسردہ اور غمگین نظر آنے لگا۔ اب وہاں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گھر اسے کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔ آخر وہ پھر اپنے سسرال واپس آ گئی۔ بالکل ناخواندہ مہمان کی طرح!

شاکر اب بھی اس سے بے نیاز تھا۔ ساس اب بھی بات نہیں کرتی تھیں۔ ثریا اب بھی بیگانہ تھی۔ ایک منصور تھا جو کبھی اس کا مصاحب اور ندیم تھا۔ جو اس سے ہمدردی رکھتا تھا۔ لیکن وہ اب بھی بدل چکا تھا۔ موقع موقع سے جلی کٹی سنایا کرتا تھا۔ الفاظ کے تیر و نشتر سے اس کا دل چھیدا کرتا تھا۔ لیکن اپنے گھر کے مقابلہ میں وہ پھر بھی مطمئن سی تھی —— یہاں!

وہ حتی الامکان منصور کے سامنے نہیں آتی تھی۔ آ بھی جاتی تھی تو کترا کر نکل جانے کی کوشش کرتی تھی۔ اور کوئی ہوتا۔ تو سنبھل جاتا۔ رُک جاتا۔ لیکن وہ ان باتوں کو کب خاطر میں لاتا تھا۔ رضیہ کی بے رخی۔ سرد مہری۔ بے تعلقی ان سب باتوں کو اس نے محسوس کیا لیکن دل تنگ نہیں ہوا۔ وہ اس کی ان گھبرائی گھبرائی حرکتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ اس نے بیچ صحن میں رضیہ کو ٹوکا۔ روکا۔ کہنے لگا۔

"تم مجھ سے بھاگتی کیوں ہو؟ میں ہوّا ہوں جو ہڑپ کر جاؤں گا نہیں۔ ارے بھئی! ایک بات تھی۔ اب تو وہ بھی ختم ہو گئی۔ خوشی کا سودا تھا وہ تو۔ لیکن نہ پٹ سکا چلو ہٹاؤ اس قصے کو۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تم مجھ سے کترا دو گی۔ اور میں ہاتھ باندھے تمہارے پیچھے پھروں گا۔ وہ اور لوگ ہوتے ہوں گے۔ میں ایسا نہیں ہوں۔ میں نے تم سے محبت کی۔ تم مجھ سے محبت نہ کر سکیں۔ میں نے بھی اپنے دل سے نکال دی تمہاری محبت، میں پاپی محبت

"میں کسی اور کو بناؤنگا۔ تم تو چھپی رہو۔ اپنے پتی دیو کو!"

رضیہ بہت دل گرفتہ تھی۔ لیکن پتی دیو کا لفظ سن کر وہ اپنا تبسم نہ ضبط کر سکی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر منصور کا حوصلہ کچھ اور بڑھا۔ اس نے کہا۔ کچھ غلط کہتا ہوں میں۔ جو کہو سچ سچ کہنا!

رضیہ نے کہا: "بابا! میں تم سے بحث نہیں کرتی۔ تم تو اس بگڑتے بگڑتے پورے بگڑنے گئے ہو۔ معاف کرو مجھے!"

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں جا رہی۔

منصور کی ان باتوں سے رضیہ کے دل کا کانٹا نکل گیا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ منصور پھر اعلائے کلمۃ الحق کرے گا۔ اور اپنی محبت کا ڈنکا پیٹنے لگے گا۔ پھر شاکر کو غصہ آئے گا۔ پھر بڑی بی بیٹے کا پارٹ لیں گی۔ اور اسے وہ چار صلواتیں سنا دیں گی۔ لیکن آج کی باتوں سے وہ مطمئن سی ہوگی۔ اس کے دل کا بوجھ اتر گیا۔ اس نے یقین کر لیا۔ اب منصور اس کے خیال سے دست بردار ہو چکا ہے۔ اب وہ پھر اس کی بھابی ہے۔ اور وہ اس کا دیور!

وہ منصور کی طبیعت سے واقف تھی۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ وہ لگی لپٹی رکھنے کا عادی نہیں ہے۔ جو کچھ کہتا ہے بے لاگ کہتا ہے۔ چاہے کسی کو برا لگے یا اچھا۔ جب تک اس پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ وہ شاکر تک سے دو دو ہاتھ کرنے پر تیار تھا۔ اب وہ بھوت اتر گیا۔ تو پھر آگیا وہ اپنی اصلی حالت پر اور صاف صاف اعلان کر دیا "محبت ختم!"

آج پہلی مرتبہ رضیہ نے اطمینان کا سانس اس گھر میں لیا۔

باب ۱۹

صنوبر

دہلی کے پرانے شرفا اور رؤسا کے ہاں اب تک کہیں کہیں لونڈیوں اور باندیوں کا سلسلہ نسلاً بعد نسلاً چلا آ رہا ہے۔ قحط کی ماری ہوئی ماں نے اپنی لڑکی بیچ دی۔ کسی میلہ میں کوئی لڑکی گم ہوگئی۔ ماں باپ غربت کے عالم میں مر گئے۔ اور ایک لڑکی لا معلوم ورثا کے لئے ترکہ کے طور پر چھوڑ گئے۔ یہ لڑکیاں جب بڑے گھروں میں پہنچتیں تو ان کی پیشانی پر قدرت کا زبردست ہاتھ جلی قلم سے "لونڈی" کا لفظ لکھ دیتا۔ اور وہ قسمت کی لکیر بن جاتا جس کے متعلق سب جانتے ہیں کہ قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔

ان مستقبل کی لونڈیوں کی پرورش پرداخت اس طرح کی جاتی کہ روٹی سے زیادہ انہیں مار کھانے کو ملتی۔ گھر میں اگر ایک پیسہ بھی گم ہو جاتے تو شک میں گھر کی ہر لونڈی گرفتار کر لی جاتی۔ اور اقرار و عدم اقرار دونوں صورتوں میں مار مار کر اس کی مستی نکال دی جاتی۔

یہ خیال حق الیقین کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ جس جنس پر تی کا اطلاق ہوتا ہے اس سے لونڈیاں بھرپور ہیں۔

ان لونڈیوں کو موٹا کپڑا پہننے کو ملتا تھا۔ تیل استعمال کرنے، عطر لگانے، بال گوندھنے اور بھڑکدار کپڑے پہننے کی انہیں بگڑ جانے کے ڈر سے ہرگز اجازت نہیں تھی۔ گھر کی بیٹیوں کو شادی میں بسلسلہ جہیز جہاں زر نقد، زیور، برتن، کپڑے، فرنیچر دیا جاتا وہاں ایک لونڈی بھی عطا کر دی جاتی تھی۔

اول تو ان لونڈیوں کے بارے میں سمجھ لیا گیا تھا کہ انہیں شادی کی ضرورت ہی نہیں ہے اور ان کا خود یہ حال تھا کہ شادی کی ضرورت لاکھ محسوس کریں مگر فرصت نہیں ملتی تھی انہیں شادی کی۔ سویرے منہ اندھیرے سے رات گئے تک مستقل طور پر اور رات گئے کے بعد سے سویرے منہ اندھیرے تک وقتاً فوقتاً انہیں مختلف خدمات انجام دینا پڑتے تھے۔

دن کا سارا وقت برتن مانجھنے میں، جھاڑو دینے میں، بچوں کو بہلانے میں، کھانا کھلانے اور پاؤں دبانے میں صرف ہوتا تھا۔ رات کو بڑی دیر میں سونے کا وقت ملتا تھا۔ اب فرض کیجئے ایک لونڈی دن بھر کام کر کے تھک کے چور ہو کے گھوڑے بیچ کر گیارہ بجے کے قریب سوئی۔ ٹھیک ایک بجے میاں یا سرکار باہر سے زنان خانہ میں تشریف لائے وہ سوتے سوتے بھی حقہ پینے کے عادی ہیں۔ فوراً لونڈی کو آوازیں دیں گے۔ چلم بھر اول تو لونڈی کا فرض یہی ہے کہ آقا کے آنے تک ہرگز نہ سوئے۔ لیکن اگر وہ سو گئی۔ تو اس کا اولین فرض یہ ہے کہ پہلی آواز پہ اٹھ پڑے۔ دوسری آواز بعد میں بلند ہوتی تھی۔ پہلے جوتے پڑنے لگتے تھے۔ جوتے کھا کے وہ گھبرا کے اٹھی۔ روتی گئی۔ کوستی گئی۔

زیر لب آقا کو گالیاں دیتی گئی۔ اور چلم بھری گئی۔ چلم حقے پر رکھ کر وہ پھر سونے لیٹی اور فوراً سو گئی۔ ٹھیک دو بجے گھر کا سب سے چھوٹا بچہ پیشاب کے لئے اٹھا۔ اب لونڈی کا پھر فرض ہے کہ وہ فوراً پیشاب کرائے۔ ذرا بھی تاخیر ہوئی اور پڑے جوتے۔ ان مصروفیتوں کے ساتھ شادی نبھ کیسے سکتی تھی؟ چنانچہ اکثر لونڈیاں جوان سے بوڑھی ہو جاتیں۔ مگر شادی کی لذت سے نا آشنا رہتیں۔ کوئی خوش قسمت لونڈی ایسی بھی نکل آتی۔ کہ گھر کے کسی خانہ زاد کے ساتھ اس کی شادی کر دی جاتی۔ لیکن شادی کے شرائط میں یہ بات بھی داخل تھی کہ لونڈی لونڈی ہی رہے گی۔ غلام غلام رہ کر شادی کرنا چاہے۔ یعنی حقوق شوہریت پر بھی اصرار نہ کرے تو شادی کر سکتا ہے۔

ان لونڈیوں میں بعض ایسی تھیں جو خاندان کی خدمت کرتے کرتے بڑھاپے میں کچھ عزت بھی حاصل کر لیتی تھیں۔ لیکن جس طرح سرکاری خطابات بالعموم ذاتی ہوتے ہیں موروثی نہیں ہوتے۔ اسی طرح ان بڑی بوڑھی لونڈیوں کی عزت صرف اپنی تک محدود رہتی تھی۔ ان کی اولاد کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔

صنوبر اس گھر کی مادر زاد لونڈی تھی۔ اس کی ماں، نانی، پرنانی اس گھر کی لونڈی کے شرف سے فائز تھیں۔ اس کی بوڑھی ماں نسترن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ وہ اپنے بے لوث خدمات کے باعث اس گھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ لیکن صنوبر اس کے سامنے بھی دھڑا دھڑ پٹتی رہتی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد کچھ دن تک تو ذرا اس کی دلجوئی ہوئی۔ اس کے بعد پھر گالیاں اور جوتے، ٹھوکریں اور طعنے وہ وقتی طور پر تو ضرور متاثر ہوتی تھی۔ جب زیادہ مار پڑی۔ تو رونے لگی لیکن چونکہ اثر جیسے ہی زائل ہوا پھر آگئی اپنے رنگ پر۔ یا ای جان کے الفاظ میں آگئی اپنی اوقات پر۔

اس کی عمر کوئی ۱۵ سال کی ہوگی۔ وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ رنگ کالا لیکن چمکدار۔ دانت موتی کی طرح سفید۔ بازو بھرے بھرے۔ نہ دبلی نہ موٹی۔ باتوں میں شیرینی۔ لب و لہجہ میں جاذبیت، ناز و انداز و اطوار میں شوخی۔ یہ تھا اس کا سراپا۔

لونڈیوں پر عنفوانِ شباب کا زمانہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ ان بے چاریوں کو مردوں سے کم عورتوں سے زیادہ سابقہ پڑتا ہے۔ گھر کی بیبیاں اُن کی جوانی کے اُبھار کو روکتی ہیں۔ ان کے شباب کی طوفان خیزیوں سے جلتی ہیں۔ فوراً پھول کی طرح مسل دیتی ہیں۔ انہیں ڈر لگتا ہے۔ کہیں یہ آقا زادہ کی نظر پر نہ چڑھ جائے اور بعد میں ایک مستقل فتنہ ثابت ہو۔ ایک ایسا طوفان جو روکے نہ رُکے سنبھالے نہ سنبھلے۔

صنوبر اب اسی دور سے گذر رہی تھی۔ وہ جوان ہو رہی تھی۔ جوانی اس پر طوفان کی طرح سوار تھی۔ وہ خوبصورت نہیں تھی۔ لیکن جوانی تھی کہ پھوٹی پڑتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے جوانی چھلکتی تھی۔ اس کی باتوں سے جوانی برستی تھی۔ اس کی رفتار سے جوانی ٹپکتی تھی۔ اس کے چہرہ پر جوانی جھلکتی تھی۔ اس کے بازوؤں، اس کے سینہ، اس کی رانوں میں جوانی سمائی ہوئی تھی۔ اُبھر رہی تھی۔ ایک پُر زور چشمہ کی طرح اپنے پھیلاؤ کے لئے وسعت ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ بیٹھتی تھی۔ لیکن اس کی سرشار جوانی ایک نشانِ منزل کی طرح کھڑی رہتی تھی۔ وہ چلتی تھی۔ تو ایک ہولناک طوفان برق و باد کی طرح اس کی جوانی اپنی مختصر کائنات پر چھا جاتی تھی۔ وہ سوتی تھی۔ تو اس کی جوانی، فتنۂ بیدار بن جاتی تھی۔

امی جان فنونِ جوانی کی پرانی رمز شناس تھیں۔ انہوں نے صنوبر کا یہ رنگ دیکھا اور بھانپ لیا۔

ابھی فتنہ ہے کوئی دن میں قیامت ہوگی

انہوں نے روک تھام شروع کر دی۔ بے بات کی بات پر سے مارتیں۔ اس کا قصور نہ ہوتا تو بھی اس سے معذرت کرا لیتیں۔ اور پھر چار چوٹ کی مار سے اسے سرفراز کرتیں۔

وہ رو رو کر سوچتی تھی۔ آخر مجھ میں ایسی کون سی تبدیلی ہو گئی ہے کہ میں بی بی کی نظروں سے گر رہی ہوں؟ میں نے کیا خطا کی ہے کہ بے رحمی سے پیٹی جاتی ہوں؟ مجھ سے کیا قصور سرزد ہوتا ہے کہ بات بات پر طعنے اور گالی سے میری تواضع کی جاتی ہے۔ اور ہاں یہ جوانی کیا چیز ہوتی ہے۔ جس کا جب دیکھو جب بی بی مجھے طعنے دیا کرتی ہیں۔ جوانی پھٹی پڑ رہی ہے موئی پر! میں جوان ہو رہی ہوں تو اس میں میری کیا خطا ہے؟ کیا یہ بی بی کبھی جوان نہیں تھیں؟ کیا رحیمہ جوان نہیں ہے؟ کیا ثریا پر جوانی نہیں پھٹی پڑ رہی ہے؟ پھر ان کی جوانی کو کوئی کچھ نہیں کہتا میری جوانی سب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔ یا اللہ میں بڈھی کس طرح ہو جاؤں؟ جوانی اتنی بری تھی۔ تو تُو نے مجھے جوان کیوں کیا؟ میں باز آئی اس جوانی سے!

کل موئی گلشن (دوسری لونڈی) کہہ رہی تھی۔ ذرا سنبھل کے رہنا جوانی پھٹی پڑ رہی ہے۔ تیرے اوپر۔ پھر کس مزے میں گنگنانے لگی۔

بچپن بھی بس میں، بڑھاپا بھی بس میں
جوانی کیوں نہیں بس میں ......!

کتنا مدھر گیت گا رہی تھی۔ لیکن میں سمجھی نہیں۔ جوانی بس میں کیوں نہیں ہے۔ اس کے جوانی کوئی گھوڑا ہے کہ سرپٹ بھاگا جا رہا ہے اور روکے نہیں رکتا کوئی ہوائی جہاز ہے کہ اڑا جا رہا ہے۔ مگر کہتا نہیں سب جوان ہوتے ہیں وہ بھی جوان ہے میں بھی جوان ہوں۔ نہ میں بس سے باہر ہوں۔ نہ وہ پھر کیوں کہہ رہی تھی وہ کہ جوانی بس میں نہیں؟

وہ ان باتوں کو سوچتی تھی۔ لیکن ان کا کوئی تسلی بخش جواب اسے نہیں ملتا تھا۔ آخر تھک ہار کے وہ اس موضوع پر سوچنا ہی چھوڑ دیتی تھی۔ اور یہ ہوگا۔ نہ جانے کیسی باتیں ہیں یہ! میری سمجھ میں تو خاک نہیں آتا۔

باب ۲۰

جوانی کی ٹکر

منصور سینما دیکھنے گیا تھا۔ ماں سے کہہ گیا تھا۔ آج رات کو دیر سے آؤں گا۔

منصور کے جانے کے بعد امی جان نے عنبر سے کہا۔ توشہ خانہ سے ایک کمبل نکال کر اوپر منصور کے کمرہ میں رکھ آ۔ اب ہلکی ہلکی سردی پڑنے لگی ہے۔ جاڑا آ رہا ہوگا۔ وہ ایک پاگل ہے۔ زبان سے تو کچھ کہے گا نہیں۔

عنبر نے اچھا کہا، اور کام کاج میں لگ گئی۔ گھر کے لوگوں نے کھانا کھایا۔ عنبر کھانے بیٹھی۔ پھر برتن مانجنے لگی۔ ان کاموں سے فارغ ہوتے ہوتے روزانہ گیارہ بج جاتے تھے۔ رات کے آج بھی یہی ہوا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ اپنی کوٹھری میں جا کر لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی اسے خیال آیا۔ بی بی نے منصور کے کمرہ میں کمبل رکھنے کو کہا تھا۔ فوراً اٹھی۔ توشہ خانہ کی کنجی اسی کے پاس رہتی تھی۔ دروازہ کھولا۔ کمبل نکالا اور چلی اوپر کی طرف سارا گھر سو چکا تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں کے دروازے بند کئے سو رہے تھے۔ دروازہ

کے پاس چمن بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ کہ منصور آجائے تو دروازہ بند کر کے وہ حسب معمول برآمدے میں سو رہے۔ یہ سناٹا دیکھ کر صغریٰ کا دل کانپ گیا۔ اوپر کوٹھے پر تو اس سے بھی زیادہ سناٹا ہوگا۔ کہیں چمن جو وہاں ہو بہت ڈری وہ اوپر جاتے ہوئے لیکن وہ جان رہی تھی۔ چمن بھی اس کا وہ نہیں بگاڑ سکتا جیسے ابھی جان حکم عدولی کے جرم میں اس کا حلیہ بگاڑ دیں گی۔ آخر وہ ڈری ڈری سہمی سہمی اوپر گئی منصور کے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ بجلی جلائی۔ اس کے بستر کی شکنیں درست کیں۔ چارپائی پر کمبل تہ کر کے رکھا۔ پھر بجلی کی طرف بڑھی کہ اسے بجھا کر واپس چلی جائے۔

اس کی نظر منصور کے پڑھنے لکھنے کی میز پر پڑی۔ ایک انگریزی رسالہ کھلا ہوا رکھا تھا۔

وہ آگے بڑھی اور جھک کر اسے دیکھنے لگی۔ ایک تصویر تھی کسی رقاصہ کی نیم عریاں حالت میں یہ تصویر دیکھ کر اس کے بدن میں نہ جانے کیوں ایک جھرجھری سی آگئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ مطمئن ہو کر ایک اشتیاق کے عالم میں اس نے رسالہ اٹھا لیا اور سامنے جو صوفہ پڑا ہوا تھا۔ اس پر جا کر بیٹھ گئی۔ وہ بالکل پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن تصویروں کی زبان خاموش کو خوب سمجھ سکتی تھی۔ وہ آرام سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور ورق گردانی کرنے لگی۔

ایک کے بعد ایک تصویر بدلتی ہوئی۔ چھیڑتی ہوئی۔ گنگناتی ہوئی اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ وہ ایک تنومند مرد اپنے مضبوط بازوؤں میں ایک خوبصورت عورت کو جکڑے ہوئے ہے۔ دونوں کے منہ ایک دوسرے سے لگے ہوئے ہیں۔ عورت کچھ شرمائی شرمائی سی ہے۔ مرد اس شرم کو اپنی کلائی سے دبائے ہوئے ہے۔ وہ یہ دوسری تصویر سامنے آئی۔ ایک مرد ایک عورت۔ عورت مرد کا بوسہ لے رہی ہے۔ اس نے ورق پلٹے [illegible] لیکن اس کے بدن میں پھر ایک بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ پھر اس نے اس [illegible]

خوبصورت مرد اور ایک خوبصورت عورت، نیم عریاں حالت میں ہم آغوش تھے۔ یہ دیکھ کر پھر اس نے جھرجھری سی لی۔ اس کی آنکھوں میں خود بخود ایک چمک سی پیدا ہوگئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش سی پیدا ہوگئی۔ رسالہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ تصویر ابھی تک اس کے سامنے تھی۔ لیکن اب وہ دوسری دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ خواب کی دنیا حسین دلکش اور جذب انگیز خواب،

وہ خواب میں دیکھ رہی تھی۔ اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہے زیور سے اس کا بدن لدا ہوا ہے۔ پھولوں کے طرے اور ہار اور گجرے اس کے بدن پر نئی بہار دکھا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک خوبصورت تنومند اور دل میں گھر کر جانے والا جوان آیا۔ اس کی آنکھوں سے مستی ابل رہی تھی اسے دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ لیکن وہ مسکرایا اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس نے اس کے قوی دست و بازو کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے یہ تو اچھا لگ رہا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ نوجوان اسے اسی طرح بھینچے جائے دبائے جائے۔

وہ اس پر راضی تھی کہ وہ جوان اپنے بازوؤں کے شکنجہ میں اسے کس لے۔ اسے چور چور کر دے تھکا دے۔

وہ اس کے بازوؤں میں سمائی چلی جا رہی تھی۔ اس کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا تھا پھر بھی وہ وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شکنجہ میں کسے کے آنسو آگئے تھے لیکن وہ خود بھی تو اس شکنجہ سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

دفعتاً اس کی آنکھ کھلی۔ وہ خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں پہنچ گئی۔ منصور کے قوی دست و بازو اسے اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھے۔ دونوں کے نتھنوں سے گرم گرم سانس نکل رہا تھا۔ دونوں کے لب ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ خواب کی دنیا میں جو

نوجوان اس نے دیکھا تھا۔ یہ اس سے بھی زیادہ نکیلا اور سجیلا تھا۔ وہ اس طرح اس کے بازوؤں میں جکڑی ہوئی تھی۔ جیسے مکڑی کے جال میں مکھی۔ منصور مسکرا رہا تھا۔

پہلے تو وہ گھبرائی۔ لیکن منصور کو مسکراتا ہوا دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگی۔ اس کی رگ رگ اور نس نس میں اس وقت بجلی سمائی ہوئی تھی۔ منصور مجسم کہربا بنا ہوا اس کے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ بھی منصور کو پیار کرے۔ وہ تصویر والی عورت بھی تو اس مرد سے پیار کر رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے منصور کو خود بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ بھی اسے بے تحاشا پیار کرنے لگی۔ منصور اس وقت اس کی نظر میں آسمان سے اترا ہوا فرشتہ تھا۔ اس کے چہرہ پر اسے نور برستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اب تک وہ کسی چیز کی کھوج میں تھی۔ تلاش میں تھی۔ تجسس میں سرگرداں تھی۔ آج وہ چیز جس کا نام اسے اب بھی نہیں معلوم بے مانگے مل گئی اور بالکل مفت!

رات کو دو بجے تک منصور اور صنوبر آقا اور لونڈی کی حیثیت سے نہیں، عاشق اور معشوق کی حیثیت سے ایک دوسرے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ منصور کو اندیشہ تھا۔ وہ اترائے گی۔ یعنی دل میں ہنسے گی۔ لیکن ظاہر میں روئے گی۔ چیخے گی۔ چلائے گی۔ مزاحمت کرے گی۔ لیکن یہ کچھ نہ ہوا۔ نہ چیخی نہ چلائی۔ وہ تو منصور سے زیادہ خوش تھی۔ منصور نے تو ایک وقتی جذبہ کی تسکین کی تھی۔ لیکن اسے تو معلوم ہوتا تھا نعمتِ دو عالم مل گئی۔

منصور ان عورتوں سے بہت نفرت کرتا تھا۔ جو اتراتی ہیں۔ "جو من چاہے منڈیا ہلائے" کی مصداق ہوتی ہیں۔ جن کے دل میں مردوں سے زیادہ آگ ہوتی ہے۔ لیکن برف کی سل بنی رہتی ہیں۔ صنوبر نے تو اپنی ساری آگ اگل دی۔ خوشی خوشی ہنس ہنس کر۔ یہ ادا اس کے دل میں کھب گئی۔

صنوبر نے دیکھا۔ آج منصور اس سے جاذب پیار کی باتیں کر رہا ہے۔ اس میں وہ آقایانہ کرختگی اور تحکم نہیں ہے۔ جو اب سے کچھ دیر پہلے تک تھا۔ منصور کی اس تبدیلی نے صنوبر کے دل کی خوشی اور بڑھا دی۔

وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے اس کی گود میں لیٹی تھی۔ منصور اس کے بالوں اور گالوں سے کھیل رہا تھا۔

اب گھڑی نے چار بجائے۔ منصور چونکا۔ اس نے آہستہ سے صنوبر کو اپنی گود سے ہٹایا، کہنے لگا۔

"اب جاؤ صبح ہو رہی ہے۔" تختِ حکومت سے فرشِ غلامی پر پھر وہ پہنچ گئی۔ دفعۃً اسے احساس ہوا۔ وہ لونڈی ہے۔ اس کے چہرہ پر کرب کی شکنیں پیدا ہوئیں۔ لیکن منصور کی گرم جوشی نے انہیں پھر ہضم کر دیا۔ جب وہ جانے لگی تو منصور نے ایک دفعہ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ وہ دھم سے اس کی گود میں آ رہی۔ منصور نے کہا "صنوبر! میں نے تجھے آج دیکھا ہے۔"

وہ بولی "تو اب تک جسے آپ دیکھتے رہتے تھے۔ وہ کوئی اور تھی؟"

منصور نے کہا "ہاں وہ گھر کی چڑیل صنوبر! میرے دل کی رانی وہ نہیں تھی تو ہے تو!"

صنوبر کے چہرے پر خوشی کی سرخی دوڑ گئی۔ اس خوشی پر اب اسی جان کی خوف کی آمریت کا ڈر غالب آ جاتا تھا۔ وہ اب پیچھے جانے کے ارادہ سے اٹھی۔

منصور نے کہا "کل پھر آئے گی؟"

صنوبر نے تو اس کی گردن ہلائی۔ اور مسکراتی ہوئی آہستہ آہستہ دبے پاؤں پیچھے

جاہل مرد عورت سب پڑھتے ہیں۔ وہ منصور کی طرف دیکھتی تھی اور گردن جھکا لیتی تھی۔ اسے گل کے کھیل کا اشتیاق تھا۔ دل میں منصور کو دیکھ دیکھ کر گدگدی سی ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کیا جادو ہے اس شخص میں۔ جیسے اتنی رات گئے اس کے پاس چلی آتی۔ نہ بی بی کے جوتوں کا ڈر، نہ میاں کی ٹھوکروں کا۔ اس وقت کے انتظار میں دن کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ جو کام مجھ سے دن بھر میں نہیں نپٹتے تھے۔ وہ میں نے پلک جھپکاتے کر لئے۔ سوچ رہی تھی کب دن ختم ہوگا۔ کب رات آئے گی۔ کب گھر والے سوئیں گے۔ کب میں اوپر جاؤں گی۔ آخر وہ گھڑی آ گئی۔ یہ خیال آتے ہی پھر سے ایسا محسوس ہوا کہ بدن کا سارا خون کھینچ کر چہرہ پر آ گیا ہے اور یہاں سے فوارہ مار کر باہر نکلنے والا ہے۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگی۔ یہ دھڑکن کیوں بڑھ رہی ہے؟ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے دل ڈوبا جا رہا ہو میرا۔

منصور کی کوشش یہ تھی۔ کہ کتاب کے جو دو تین صفحے باقی ہیں انہیں ختم کر دے۔ پھر رات کا باقی حصہ صنوبر کے پہلو میں گذار دے۔ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ منصور کتاب دیکھ رہا تھا۔ لیکن کتاب کے حروف کچھ مٹے مٹے کچھ مدھم مدھم سے نظر آنے لگے۔ وہ ایک ایک سطر کو کئی بار پڑھتا تھا۔ مگر سمجھتا خاک نہیں تھا۔ صنوبر کے آتے ہی یہ معلوم ہوا اس پر بجلی گر پڑی۔ وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ بدن میں خون گردش کر رہا تھا۔ اور خون کے ساتھ دل بھی اور دل کے ساتھ دماغ بھی اور دماغ کے ساتھ یہ کمرہ بھی۔ یہ گھر بھی۔ یہ ساری کائنات بھی زمین بھی آسمان بھی۔ دریا بھی سمندر بھی۔ درخت بھی۔ پہاڑ بھی۔ وہ سوچنے لگا۔ میں نے ان گنت عورتوں کو دیکھا۔ پرکھا۔ جانچا۔ بہت سی عورتیں تھیں۔ جنہیں میں نے چاہا۔ جنھوں نے مجھے چاہا۔ وہ بھی جوان تھیں وہ بھی خوبصورت تھیں۔ دولت مند

بھی تھیں۔ آداب مجلس کی ماہر بھی۔ یہ چھوکری سب پر بازی لئے جاتی ہے۔ حالانکہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کے مقابلے میں خاک بھی نہیں۔ یہ چھوکری ہے یا جادوگرنی؟ اس نے کوئی تعویذ تو نہیں پلا دیا مجھے گھول کر۔ اس نے کچھ پڑھ کے تو نہیں دیا میرے اوپر۔ لاحول ولاقوۃ ایک حرف جو سمجھ میں آ رہا ہو کتاب کا۔

وہ اٹھا۔ اس نے زور سے کتاب میز پر پٹخی۔ اور صوفے پر صنوبر کے بالکل پاس آ کر بیٹھ گیا۔ جیسے دو جڑواں ہستیاں پاس بیٹھا تھا کہ دونوں بے خود ہو گئے۔ دونوں پھر نشہ سے بدمست ہو گئے۔ دونوں پھر آپے سے باہر ہو گئے۔ اب نہ کوئی اصول تھا نہ معیار۔ ایک طوفان تھا بلاخیز۔ مہیب۔ بیکراں جس میں تنکے کی طرح یہ دونوں بہتے چلے جا رہے تھے۔ نہ ساحل کا نشان تھا نہ منزل کا پتہ۔ نہ دو کشتی نہ چپو۔ نہ بادبان چلے جا رہے تھے۔ بہے چلے جا رہے تھے۔

دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ دونوں اپنا کھیل کھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ گھڑی نے چار بجائے۔ دونوں چونک گئے

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
قدرت نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

ان دونوں نے محسوس کیا۔ عمر کی ایک گھڑی کم نہیں ہوئی۔ عمر ہی ختم ہو گئی۔ زندگی مر گئی۔ دونوں سنبھلے۔ اٹھے اور ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ دونوں پاس کھڑے تھے۔ لیکن جدا ہونے کے لئے صنوبر نے جلدی اپنے سر کے الجھے ہوئے بال ٹھیک کئے۔ منہ پر کہیں کہیں کچھ نشان سے رہ گئے تھے۔ انہیں ہاتھ سے زور زور سے ملا کہ سطح ہموار ہو جائے۔ گالوں کی اوڑھنی جو صوفے سے کچھ نیچے ڈھلک پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر ٹھیک سے

اوڑھا۔

اس وقت اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ منصور نے اپنے بازوؤں کے سہارے اسے لے لیا۔ اس نے پوری بے تکلفی سے اپنا بوجھ ان مضبوط بازوؤں پر ڈال دیا۔ نشیلی آنکھوں سے منصور کی طرف دیکھا اور گردن جھکا لی۔

منصور نے بے خودی کے عالم میں اس کی آنکھوں کو چوما اور چومتا رہا۔ جن آنکھوں سے اس وقت صنوبر نے منصور کو دیکھ کر گردن جھکالی تھی۔ وہ اس وقت اسے بڑی پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں کوئی پیام تھا۔ کوئی بات تھی۔ کوئی روح تھی۔ "یہ سہارا چھین تو نہ لوگے؟" سب کا خلاصہ یہ تھا۔

کمرہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیکن صنوبر کی آنکھوں کا پیام اس میں گونج رہا تھا۔ اس کی آنکھوں نے جو بات کہی تھی۔ وہ صاف سنائی دے رہی تھی۔ صنوبر کا چہرہ سورج کی طرح جگمگاتا ہوا اسے معلوم ہو رہا تھا۔ آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی ظالم پر۔

گھڑی کی سوئی اپنی منزل تیزی سے طے کر رہی تھی۔ دونوں یہ چاہتے تھے۔ کہ وہ چلنا بھول جائے۔ لیکن وقت کی طاقت اسے رواں دواں۔ خراماں خراماں آگے بڑھائے لئے جا رہی تھی۔ اسے گردش پر مجبور کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گھڑی کی سوئی تیر کی طرح ان کے دل میں پیوست ہو کر آگے بڑھ رہی تھی۔

صنوبر نے کہا۔

"بڑی دیر ہو گئی۔ اب جاؤں؟"

منصور نے جواب دیا۔

"جاؤ۔ لیکن کل پھر آنا ضرور۔"

اس نے پھر کل کی طرح اثبات میں گردن ہلائی۔ اور چلی۔ منصور اسے دیکھتا رہا۔ وہ چور کی طرح پھونک پھونک کے پاؤں رکھ رہی تھی۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ منصور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

صنوبر تو جاتے ہی سو گئی۔ لیکن منصور کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ نیند کو بلا رہا تھا۔ لیکن نیند کی دیوی اس سے روٹھی ہوئی تھی۔ بار بار صنوبر کا خیال صنوبر بن کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا تھا۔

وہ پھر خیال کی دنیا میں پہنچ گیا۔ وہ غور کر رہا تھا۔ حسن شباب کے بڑے بڑے طوفان میری نظر کے سامنے سے گذرے۔ لیکن میں چٹان کی طرح اپنی جگہ جما رہا۔ اور یہ ذلیل چھوکری کیسا عجیب طوفان ہے۔ جس کے پہلے ہی ریلے میں میرے پاؤں ڈگمگا گئے اور میں بے بسی کے ساتھ بہنے لگا۔

اسی گھر میں یہ پیدا ہوئی۔ پلی۔ بڑھی۔ جوان ہوئی۔ لیکن اس کا طوفان کتنے دبے پاؤں آیا کہ مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ تو کب؟ جب وہ پوری طاقت سے مجھے لے ڈوبا۔

کل رات کے ۱۰ بجے تک وہ گھر کی دوسری باندیوں کی طرح ایک باندی تھی جسے میں نے کبھی منہ بھی نہیں لگایا۔ لیکن سینما سے واپس آکر جب میں نے اسے اپنے صوفے پر خود فراموشی کے عالم میں سوتے دیکھا۔ تو میں نے دیکھا وہ جوانی کا ایک ایسا اٹھتا ہوا دریا ہے۔ ایسا پر خروش طوفان ہے جس نے میرے سفینۂ شباب کو تہ و بالا کر دیا جس نے میری کشتئ دل کو الٹ دیا۔ جس نے میری زندگی کی ناؤ کو ایسے دھارے پر پہنچا دیا۔ جہاں سے واپسی کا۔ بازگشت کا۔ رجعت کا کوئی امکان ہی نہیں۔

یہ دنیا بھی کیسی کیسی حشر سامانیاں اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہے۔ صنوبر کی محشر

...یرامانی معاذ اللہ اب اس کا یہ حال ہے تو آگے چل کر یہ کیا ہوگی؟"

...ب اس کے ہونٹ بھاری پڑنے لگے تھے۔ پلکیں معانقہ کر رہی تھیں۔ نیند کی روٹھی ہوئی دیوی اس کی آنکھوں میں سمائی جا رہی تھی وہ سو گیا۔

باب ۲۱

نیا آشیانہ

شاکر سے ملنے آج مسعود پھر آیا تھا۔ دونوں باہر کے کمرہ میں بیٹھے ہوئے پوری بے تکلفی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔

مسعود نے کہا۔

"کہو بھئی کیا حال ہے۔ تمہاری زہرہ کا؟"

"میں کیا جانوں؟"

"اب تک کھٹ پٹ ہے تم دونوں میں؟"

"کھٹ پٹ نہیں ترک تعلق"

"رضیہ کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے"

"لے لی زہرہ کی جگہ رضیہ نے؟"

"اماں چھوڑو ان باتوں کو۔"

"رضیہ کے ذکر سے بدکتے کیوں ہو۔ اچھا چھوڑو اس کا ذکر۔ یہ تو بتاؤ زہرہ کا ستارۂ حسن کب تک بے گہن رہے گا؟"

"تمہیں کیا؟"

"بتاؤ تو"

"بھئی مجھے خواہ مخواہ کی خوشامد پسند نہیں۔ وہ اینٹھتی گئیں کھنچی کھنچی گئیں دور ہوتی گئیں۔ مجھ سے جتنا ہو سکا تعاقب کیا۔ لیکن وہ اتنی دور ہو گئیں کہ میں نے تنگ آکر پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔"

"اچھا کیا لیکن ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور پوچھو"

"تو میں سمجھ لوں تم تائب ہو گئے؟"

"یہ تو جناب کا حسن ظن ہے"

"تو کسی اور کو ڈھونڈ لیا؟"

"اور کیا"

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

"تو یہ بات ہے جناب!"

"اور نہیں تو کیا"

"اب کہاں آشیانہ ہے آپ کا"

"یاسمین کے ہاں"

"اوہ میں سمجھ گیا۔ وہی جو بہار اور بکرم پور کی مغنیہ تھی۔ وہاں سے بھاگ کر یہاں آگئی۔ اور یہاں آکر اس نے اپنا ڈیرہ جما دیا۔"

"خوب سمجھے وہی"

"کیسی گذر رہی ہے؟"

"بہت خوب! نہ وہ زہرہ کی سی فلسفہ طرازیاں ہیں نہ نکتہ سنجیاں۔ وہ ہے اور میں ہوں۔ میں ہوں اور وہ ہے۔ حسن ہے اور عشق۔ عشق ہے اور حسن۔ وہ ہمہ تن میری پذیرائی کو مستعد اور میں ہر آن اس کے لئے وقف۔ یہی مراد ہے محبت کا عیش کا۔"

مسعود چپ چاپ سنتا رہا۔ شاکر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پھر کہا۔

"مجھے ان عورتوں سے بڑی نفرت ہے۔ جو قابل فہیم ہیں۔ فلسفہ چھانٹتی ہیں۔ میں تو سپردگی چاہتا ہوں۔ وکیلوں اور بیرسٹروں کی سی بحث نہیں چاہتا۔ زہرہ سے جب تک رسم وراہ تھی رضیہ کی جگہ بھی میرے دل میں تھی۔ لیکن جب سے یاسمین میرے دل کی مکین ہوئی ہے۔ کسی کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی ہے!"

"پھر رضیہ کو آزاد کیوں نہیں کر دیتے۔ سچ تو کہہ رہا تھا منصور نہ ہٹتے ہو۔ نہ راستہ دیتے ہو۔"

منصور رضیہ کو بھول بھی چکا۔ وہ ٹھہرا ایک رند مزاج۔ جس زور و شور سے اعلان عشق کیا تھا اس نے ویسے ہی ڈنکے کی چوٹ رضیہ کی بے رخی دیکھ کر وہ دستبردار بھی ہو گیا اپنے عشق سے۔

"اور ہاشم"

"پھونک! ہاشم! بھاگ گیا میدان چھوڑ کر"

"وہی رضیہ کی بے رخی کے سبب؟"

"ہاں اور کیا"

"خوب انعام دے رہے ہو تم رضیہ کو!"

"یہی تو دنیا کی ریت ہے۔ ہاشم رضیہ کو چاہتا ہے۔ لیکن وہ اس سے محبت نہ کر سکی۔ رضیہ مجھے چاہتی تھی۔ لیکن میں اسے پیار نہ کر سکا۔ میں زہرہ کو چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔"

"اور یاسمین"؟

اب تک تو خوب نبھے جا رہی ہے۔

عاقبت کی خبر خدا جانے!

"وہ بھی تمہیں چاہتی ہے"؟

"بہت زیادہ"

"اور تم"؟

"میں تو عشق کرتا ہوں اس سے"

"تو یہاں تمہارا کلیہ غلط ہو گیا"

"کون سا کلیہ"؟

"یہی کہ دو محبت کرنے والے کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہوں"

"اماں ہر کلیہ میں ایک آدھا استثنا بھی تو ہوتا ہے۔ تم بھی یونہی رہے!"

یہ کہہ کر شاکر ہنسنے لگا۔ مسعود نے بھی ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ جو شاکر کی ہنسی میں گم ہو گیا۔

باب ۲۲

"عقدِ ثریا"

کالج کے درمیانی وقفہ میں حسب معمول ثریا اور شاہد کی ملاقات ہوئی۔ وہ رعنائی و جمال کی تصویر بنی ہوئی۔ شاہد کے قریب آئی۔ شاہد نے اسے دیکھا۔ اور نہ جانے کس عالم میں پہنچ گیا۔ ثریا اس کی بے خودی کا جوش دیکھ کر شرما گئی۔ اس نے کہا۔

"بدنگاہ کہیں کے۔ مجھے گھور کیوں رہے ہو؟"

شاید اتنا محو تھا کہ بت بنا کھڑا رہا۔ اس نے کوئی جواب بھی نہیں دیا۔

ثریا مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور سرگوشی کے لہجہ میں شاہد سے کہنے لگی۔

"ہاں یاد ہے تمہاری شادی ہے نا رئیس اعظم صاحب سے؟"

"ہاں — دیکھو آنا ضرور!"

"نا بھئی میں نہیں آتا۔"

"وعدہ جو کیا تھا؟ بھول گئے؟"

"بھولا نہیں لیکن مجھے ڈر لگتا ہے"

شاہد بھی ہنسنے لگا۔ اور ثریا بھی مسکرا دی کہنے لگی۔

"بزدل کہیں کے"

"میرا دل تو عورتوں سے بھی زیادہ نازک ہے"

"سچ کہتی ہوں۔ عورتوں کا دل بھی تم سے مضبوط ہوگا۔ مجھی کو دیکھ لو"

"دیکھ تو رہا ہوں۔ آنکھ ہی نہیں ٹھہرتی کیا شعر کہہ گیا ہے شاعر ے

وہ حسن نہیں نام خدا اور ہی کچھ ہے

انداز نرالا ہے ادا اور ہی کچھ ہے

"شاعری بعد میں کرلینا۔ آنا ضرور۔ نہیں تو لڑائی ہو جائے گی"

"اب ضرور آؤں گا۔ مطمئن رہو"

اس گفتگو کے بعد بہار جانفزا کی طرح اپنا اثر اور اپنی خوشبو پھیلا کر وہ دوسری طرف چلی گئی۔ اور شاہد اپنے درجہ میں آ بیٹھا۔

دوسرے روز شاکر کے گھر میں اک دھوم مچی ہوئی تھی۔ آج ثریا کی شادی تھی۔ دور دور سے عزیز قریب شرکت کے لئے آئے تھے۔ برات کے دولہا نواب رشید محمود مع اپنے لاؤ لشکر کے پہنچ چکے تھے۔ اس تقریب کے انتظامات میں شاکر اور منصور برابر کا حصہ رہے تھے۔ ثریا دونوں بھائیوں کی چہیتی اور لاڈلی تھی۔ زنان خانہ مہمان عورتوں سے اور مردانہ مرد مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔

گھر میں ثریا دلہن بنائی جارہی تھی۔ ڈومنیاں اور میراثنیں گا رہی تھیں۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ ثریا کی ہم سن لڑکیاں اس کے گرد حلقہ بنائے بیٹھی تھیں۔ وہ ایسی معلوم ہو رہی

تھی۔ جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چاند۔ چاند کی روشنی تاروں کے نور کو ماند کر دیتی ہے۔ یہی حال اس انجمن کا تھا۔ ثریا کے حسن اور رعنائی نے سکھیوں اور سہیلیوں کی خوبروئی کو ماند کر دیا تھا۔ صنوبر ثریا کی منہ لگی تھی وہ بھی بڑھ بڑھ کے کام کاج میں حصہ لے رہی تھی۔

ثریا بڑی دلچسپی اور انہماک سے اپنے تئیں دلہن بنوا رہی تھی۔ کوئی اس کی چوٹی گوندھ رہا تھا۔ کوئی اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔ کوئی اسے نظر غائر سے دیکھ رہا تھا اور جل رہا تھا۔ یہ خاص سہیلیوں کا مجمع تھا۔ آپس میں چہلیں بھی ہو رہی تھیں۔ رضیہ نے کہا۔

"اب کاہے کو یاد کریں گی بی ثریا ہمیں"

شاہجہاں بولی۔

"ہاں بھئی! جسے یاد کریں گی۔ ہم اب کس شمار قطار میں ہیں"

رضیہ نے کہا

"تو بن جاؤ تم رشید۔ پھر ثریا تمہارے ہی پاس رہیں گی عمر بھر"

شاہجہاں بولی۔

"اچھا بھئی یہی سہی"

یہ کہہ کر وہ باہر نکلی۔ صنوبر سے کچھ سرگوشیاں کیں اور سیدھی منصور کے کمرہ میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رشید محمود بن کر نمودار ہوئی۔ چوڑی دار پاجامہ۔ اعلیٰ درجہ کی شیروانی سر پر کشتی نما ٹوپی۔ وہ آئی اور آتے ہی اس نے جھڑک کر کہا۔

"ہٹ جاؤ تم لوگ میری بیوی کے پاس سے"

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

وہ تو پسینہ میں تر بتر ہو رہی ہے۔ اس کا دم گھٹا جا رہا ہے اور تمہیں چہلیں سوجھی ہوئی ہیں!"

یہ کہہ کر شاہجہاں نے رقیہ اور رضیہ کو پرے ہٹایا اور خود جا کر ثریا کے پاس زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئی۔ رقیہ اور رضیہ ہنسنے لگیں اور ثریا بھی کھلکھلا دی۔

اتنے میں غلغلہ ہوا قاضی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ اب ثریا کا کمرہ اس کی سہیلیوں کا نہیں گھر بھر کی عورتوں کا دربار عام بن گیا تھا۔ سب عورتیں قاضی صاحب کے بول اور ثریا کی ہوں سننے کا تماشا دیکھنے کے لئے اس مختصر سے کمرہ میں ٹوٹ پڑی تھیں۔ ثریا اور اس کی بعض سہیلیاں اگرچہ پردہ نہیں کرتی تھیں۔ لیکن اس کی ماں، بھاوج اور گھر کی دوسری عورتیں سخت پردہ کرتی تھیں۔ آج چونکہ شادی کا دن تھا اور بہت سے عزیز آئے ہوئے تھے۔ اس لئے پردہ کا انتظام اور زیادہ سخت تھا۔

بہر حال قاضی صاحب شاکر اور بعض دوسرے عزیزوں کے جلو میں تشریف لائے ثریا جس کمرہ میں تھی۔ اس کے دروازہ پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے پورے الحان اور قرأت کے ساتھ ارشاد فرمایا۔

"ثریا بیگم! میں نے آپ کا نکاح ایک لاکھ روپیہ مہر کے بالعوض جناب نواب رشید محمود کے ساتھ باندھا۔ کیا آپ کو قبول ہے؟"

دفعتہً ثریا کی آواز فضا میں بلند ہوئی۔

"ہرگز نہیں"

قاضی صاحب اس طرح چونک پڑے۔ جیسے بھولے سے انگارے پر بیٹھ گئے ہوں۔ شاکر کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ امی جان کے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ رضیہ کو

جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ایک سہیلی نے دوسری کو دوسری نے تیسری کو تیسری نے چوتھی کو سلسلہ بہ سلسلہ دیکھنا شروع کیا۔ سارے کمرہ پر سناٹا چھا گیا۔

قاضی صاحب نے جو کچھ سنا تھا اسے ثقل سماعت پر محمول کیا۔ بڑی مشکل سے اپنے حواس پھر مجتمع کئے اور ایک مرتبہ اور اچھی طرح کھنکھار کے انہوں نے کہا۔

"ثریا بیگم! میں نے آپ کا نکاح ایک لاکھ روپیہ مہر کے بالعوض جناب نواب رشید محمود کے ساتھ باندھا۔ کیا آپ کو قبول ہے؟"

اب کے ثریا نے ذرا تلخی کے ساتھ کہا۔

"قاضی صاحب! آپ کتنے مرتبہ مجھ سے پوچھیں گے؟ کہہ تو رہی ہوں کہ نہیں۔ منظور ہے۔ آپ کے نواب صاحب کے ساتھ نکاح۔ لائیے قلم دوات لکھ کے دے دوں۔ اپنا انکار تاکہ سند رہے۔ اور بوقت ضرورت کام آئے۔"

کمرہ پر اب بھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے قفل سکوت توڑا۔

"کیا معاملہ ہے شاکر میاں!"

شاکر میاں کے خود حواس گم تھے۔ کیا جواب دیتے۔ اتنے میں منصور آ گیا۔ اس نے دیکھا۔ جملہ حاضرین بانکیں زندہ بصورت مردہ کھڑے ہیں۔ آنکھیں چل رہی ہیں زبان سب کی بند ہے۔ اس نے قاضی صاحب سے پوچھا۔

"کیا بات ہے قاضی صاحب!"

"کچھ نہیں!"

"کچھ تو ضرور ہے"

"ان صاحبزادی شادی سے انکار فرما رہی ہیں۔"

"ثریا نواب صاحب سے شادی کرنا نہیں چاہتی، انکار کرتی ہے؟"

"جی ہاں!"

"تو قصہ ختم۔ یہ فکر کاہے کی۔ چلئے باہر نکاح اور شادی تو خوشی کا سودا ہے"

یہ کہہ کر وہ باہر جانے کے لئے آگے بڑھا۔ آگے آگے وہ، پیچھے پیچھے شاکر، قاضی صاحب اور دوسرے لوگ۔

منصور نے آتے ہی نواب رشید محمود صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

"نواب صاحب ثریا آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتی!"

یہ سن کر ایسا معلوم ہوا جیسے ان پر بجلی گر پڑی۔ وہ سن سے ہو گئے۔ ایک منٹ تک وہ اور حاضرین بالکل خاموش رہے۔ پھر انہوں نے حواس بجا کر کے کہا۔

"کیا فرمایا آپ نے؟"

"ثریا آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"پھر آپ لوگوں نے مجھے بلایا کیوں؟"

"یہ بھائی صاحب سے پوچھئے"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ مجمع پر عجیب طرح کی سوگواری چھائی ہوئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر گھر کے کونے کونے اور گھر سے شہر کے کوچہ و بازار میں پھیل گئی۔ لوگ تعزیت اور صبر کی تلقین کے لئے شاکر اور منصور کے پاس جوق در جوق آنے لگے۔ شاکر کا جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اتنی بڑی ذلت اور رسوائی دیکھنے کے لئے وہ زندہ کیوں رہا؟

اور ادھر نواب صاحب کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ جو جی میں آرہا تھا کہہ رہے تھے۔

ان کی خفگی بجا تھی۔ اس لئے ان کی باتوں کو بھی گھر کے لوگ بڑے صبر و تحمل سے سن رہے تھے۔ نواب صاحب نے حکم دیا، فوراً اسباب بندھے۔ فوراً اسباب بندھ گیا اور وہ بغیر یہ معلوم کئے کہ گاڑی کا وقت ہے یا نہیں اپنے خدم و حشم کے ساتھ اسٹیشن روانہ ہو گئے۔

گھر پر عجیب سوگوار سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ چہل پہل، وہ رونق۔ وہ گہما گہمی رخصت ہو چکی تھی۔ نہ ڈھولک بج رہی تھی۔ نہ مجرا۔ نہ میراثنیں گا رہی تھیں۔ نہ ڈومنیاں۔ نہ کوئی انعام کے لئے جھگڑ رہا تھا۔ نہ کوئی حق مانگ رہا تھا۔ بہتر سے بہتر کھانا آج زیادہ سے زیادہ تعداد میں پکا تھا۔ لیکن سب کا جی کھانے سے سیر تھا۔ وہ یونہی پڑا ہوا تھا چوہوں اور بلیوں کی دعوت عام تھی۔

رات بھیگ گئی۔ بہت سی مہمان عورتیں رخصت ہو گئیں۔ ثریا کو گھورتی ہوئی اور زیر لب بڑبڑاتی ہوئی جو خواتین دور دراز سے زحمت سفر گوارا کر کے آئی تھیں۔ وہ گم سم تھیں۔ انہیں بھی نہ کھانے کی فکر تھی۔ نہ پانی کا ہوش۔ وہ بھی بہت افسردگی اور اضمحلال کے ساتھ گئیں۔ اور اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئیں۔

"سب کے ذہن میں یہی خیال گردش کر رہا تھا۔ یہ کیا کیا ثریا نے؟ کم بخت نے ناک کٹا دی خاندان کی۔ کہیں شریف لڑکیاں ایسا بھی کرتی ہیں!"

رات کو ۱۰ بجے کے بعد بالاخانہ پر منصور کے کمرہ میں ہائی کورٹ کی اسپیشل ٹریبونل کا اجلاس شروع ہوا۔ شاکر جج تھا۔ ثریا ملزم۔ منصور اس کا وکیل۔ امی جان اور رضیہ آنریبل ارکان جیوری۔

وفور تاثر سے لرزتی ہوئی آواز میں شاکر نے کہا۔

ثریا تم نے ہماری ناک کٹا دی۔ ہمیں منہ دکھانے کے قابل نہ رکھا۔ ہمیں رسوا اور ذلیل

کر دیا۔ کیا بگاڑا تھا میں نے تیرا؟"

منصور نے کچھ بولنے کا ارادہ کیا تھا کہ ثریا نے کہا۔

"بھائی جان آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا کیا میں نے؟"

"کچھ نہیں کیا تو نے؟ تو نے ہمیں بھری برادری میں ذلیل نہیں کیا؟"

"ہرگز نہیں"

"تو نے شادی سے انکار نہیں کیا؟"

"تو؟"

"یہ آج تک کسی شریف گھرانے میں ہوا ہے؟"

"شریف گھرانوں میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ بھائی جان اس کا تو ذکر نہ کیجئے۔ باقی رہا اس کا اقرار کرتی ہوں کہ میں نے انکار کیا۔ اور اس کا شرعاً قانوناً ہر طرح سے مجھے حق تھا۔"

"ہمیں رسوا کرنے کا؟"

"جی نہیں۔ شادی سے انکار کرنے کا۔ میں عاقل ہوں۔ بالغ ہوں۔ تعلیم یافتہ ہوں۔ مجھے شرع بھی اس کی اجازت دیتی ہے اور قانون بھی جس سے جی چاہے میں شادی کروں اور جس سے نہ جی چاہے انکار کر دوں۔"

اماں جان بولیں۔

"تو پہلے تو نے کیوں نہیں بتا دیا تھا ہمیں؟"

"پوچھا تھا آپ نے مجھ سے؟ جب مجھ سے پوچھا گیا میں نے اپنے دل کی بات بتا دی۔"

امی جان پھر بولیں۔

"نوج ایسی لڑکی ہو کسی کی۔ ایسی لڑکی پیدا ہوتے ہی مر جائے تو اچھا ہے۔"

ثریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منصور نے کہا۔

"تو آخر اس میں غضب کیا ہو گیا۔ ثریا خود اپنے بھلے برے کو سمجھتی ہے۔ نہیں بھتے نے نواب صاحب پسند اس نے انکار کر دیا۔ زندگی اسے بسر کرنی تھی نواب صاحب کے حرم میں آپ کو یا مجھے نہیں!"

"تو نہ بول منصور۔ ساری آگ تیری لگائی ہوئی ہے۔ موا نالائق نہ بھائی کا نہ بہن کا۔ میں تیرے بجائے سانپ جنتی تو اچھا تھا۔ ڈرپ مرنے کو جی چاہتا ہے میرا۔"

پھر وہ ثریا سے مخاطب ہوئیں۔ کہنے لگیں۔

"تیری جگہ کوئی شریف لڑکی ہوتی تو خاندان کی آن۔ ماں کے نام اور بھائی کی لاج کا پاس رکھتی۔ کوئی لنگڑا لولا ہوتا اس کے ساتھ بھی زندگی بسر کر دیتی۔"

ثریا نے بڑی سادگی سے کہا۔

"امی جان! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ اول تو میں جھوٹ موٹ کی باتوں کی قائل نہیں۔ خاندان کی آن۔ ماں کا نام بھائی کی لاج یہ سب تا نوی باتیں ہیں۔ پہلی چیز میری پسند اور مرضی ہے۔ دوسرے میری تو شادی بھی ہو چکی ہے۔ میں اپنے شوہر کی زندگی میں دوسرا نکاح کیسے کر لیتی؟ یہ انصاف ہے؟"

یہ الفاظ بم کے گولے کی طرح جملہ حاضرین پر گرے۔ اماں جان نے سر پیٹ لیا۔ رونے لگیں۔

"کیا کہہ رہی ہے تو نا شدنی؟"

شاکر نے کہا۔

"مار ڈالوں گی میں تجھے"

رضیہ نے کہا۔

"بڑا دل گردہ ہے تمہارا ثریا؟"

ثریا سب کی سنتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔

"میں جو کچھ کہہ رہی ہوں۔ سچ ہے۔ میں شادی کا اندراج رجسٹرار کے دفتر میں کرا چکی ہوں۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔ گھل گھل کر مرنے سے میں اسے بہتر سمجھتی ہوں کہ ایک دفعہ کوئی میرا گلا گھونٹ دے۔ یا پستول مار دے۔"

شاکر نے کہا

"کس سے شادی کی ہے تو نے؟"

"شاہد سے"

یہ سنتے ہی قریب تھا کہ شاکر کی حرکت قلب بند ہو جائے۔ اس کے منہ پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ اس نے کڑک کر پوچھا۔

"کون شاہد؟"

"وہی جو میرے ساتھ کالج میں پڑھتا ہے۔"

اور زیادہ گرج کر شاکر نے کہا۔

"تو جانتی ہے وہ کون ہے؟ کس خاندان کا فرض ہے۔ کیسا آدمی ہے؟"

"یہ میں قطعاً نہیں جانتی۔ وہ کون ہے اور کس خاندان کا ہے۔ البتہ یہ میں جانتی ہوں کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے وہ۔"

اب کے پھر شاکر نے چیخ کر کہا۔

"اوہ! ننگ خاندان چپ۔ وہ شاہد ہے۔ زہرہ کا بھائی طوائف کا بچہ!"

"ممکن ہے آپ کی اطلاع صحیح ہو تو بھی مجھے کیا۔ اس کی بہن طوائف ہے۔ ممکن ہے اس کی ماں بھی طوائف ہو۔ لیکن وہ تو طوائف نہیں ہے۔ میں خوب جانتی ہوں۔ وہ بہتوں سے زیادہ شریف ہے!"

"یہ شادی نہیں ہو سکتی"

"ہو بھی چکی وہ تو"۔ ثریا نے بڑے استقلال اور بے پروائی کے ساتھ کہا۔

"میں اسے اس گھر میں گھسنے نہیں دوں گا۔"

"اس گھر پر جتنا حق آپ کا ہے اب اتنا ہی ان کا بھی ہے!"

"میں تجھے بھی گھر کے باہر نکال دوں گا۔ ایک حبہ تجھے جائیداد میں سے نہیں ملے گا۔"

"کیوں نہیں ملے گا۔ کیا جائیداد و مکان۔ سامان یہ سب کچھ میرے باپ کا نہیں ہے۔ کیا ان چیزوں میں میرا حصہ نہیں ہے۔ کیا میں اپنے باپ کے ترکہ اور ورثہ سے محروم رہوں گی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہونے دوں گی۔ میں اپنا حصہ لے کر رہوں گی۔ آپ نہیں دیجئے تو میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گی۔"

"ایک رنڈی بچہ سے شادی کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی مردار"؟ امی جان نے بڑی برہمی سے کہا۔

"کیوں شرم آتی؟ بہت سے رنڈی بچے بھی شریفوں کی اولاد ہوتے ہیں۔ آپ ہی کہہ رہی تھیں۔ وہ گلنار جس کے گانے کی اتنی دھوم ہے خان بہادر اشرف حسین کی لڑکی ہے۔ اس کی ماں رنڈی تھی اور وہ ہماری بھابی ریحانہ جس کی شادی ابھی چند دن ہوئے، ایک

ڈپٹی کلکٹر سے ہوئی ہے۔ سر امجد علی کی لڑکی ہے۔ اس کی ماں رنڈی تھی۔ اسے انہوں نے گھر میں ڈال لیا تھا۔ پھر اگر شاہد بھی ایک رنڈی کا بچہ ہے تو کیا ہوا؟"

ثریا کچھ دیر چپ رہی، پھر اس نے کہا۔

"اور امی جان یہ تو بتائیے ذرا۔ رنڈیوں کو یہ اتنے اعلیٰ درجہ کے حسب نسب کے بچے مل کہاں سے جاتے ہیں کیا؟"

"وہ گھورے پر سے اٹھا لاتی ہیں انہیں۔ وہ سید صاحب یہ شیخ صاحب، وہ خان بہادر صاحب۔ یہ سیٹھ صاحب وہ حضرت مولانا صاحب اور یہ مسٹر صاحب سب رنڈیوں کے رسیّے ہوتے ہیں۔ سب اپنی شرافت جیب میں رکھ کر ان کے دروازہ پر بھکاری بن کر جاتے ہیں۔ سب ان کی جھولیوں میں اپنے بچے ڈال کر آتے ہیں۔ پھر ان شریفوں کے شریف زادوں کو وہ بے چاری رنڈیاں کیا کریں۔ کیا پھینک دیں انہیں۔ گھورے پر اگر رنڈیاں اتنی ہی بری ہیں۔ تو یہ شریف لوگ، وہاں جاتے کیوں ہیں؟

برا تو معلوم ہوگا۔ لیکن جس شاہد کا نام لیتے ہوئے بھائی جان اتنے برہم ہو رہے ہیں۔ اسی کی بہن زہرہ کے ہاں، وہ ہمیشہ سے جاتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے جائیداد تباہ کی۔ بیوی سے بے تعلق ہوئے بچے کا منہ نہ دیکھا۔ خاندان کی آن۔ ماں کے نام اور بہن کی لاج کا خیال نہ کیا۔ وہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی شریف ہیں۔ اور شاہد جو انسان کے روپ میں فرشتہ ہے۔ جتنا خوبصورت ہے اس سے کہیں زیادہ خوب سیرت ہے۔ اس قابل بھی نہیں کہ بھائی جان کی گنہگار۔ بہن کا شوہر بن سکے۔ آخر یہ کون سا اصول ہے؟ مجھے سمجھا دیجئے میں مان لوں گی۔"

"اے چل چل۔ مجھے کون سمجھائے۔ کیسی قینچی کی طرح زبان چل رہی ہے۔ جی چاہتا ہے

دوکا لگا دوں اس منہ میں!"

بغیر کسی فیصلے پر پہنچے ہوئے عدالت عالیہ برخاست ہو گئی۔ پہلے رضیہ کھسکی پھر امی جان اٹھیں۔ پھر منصور اپنی کتاب پڑھنے لگا۔ شاکر اٹھا، اور باہر چلا گیا۔ ثریا بدستور اپنی جگہ بیٹھی تھی۔

جب وہ جانے لگی تو منصور نے اس کی طرف دیکھا اور بڑی شفقت سے کہا۔

"ثریا میں تیرے ساتھ ہوں"

"مجھے بھی امید تھی بھیا تم سے"

یہ کہہ کر اس نے اپنا دوپٹہ گلے میں ڈالا اور نیچے چلی گئی۔

باب ۲۳

پھاہا

ہاشم کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ عجب دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ وہ کئی کئی روز کملا کے بالاخانے پر نہ جاتا۔ وہ ہر وقت شراب کے نشہ میں مست رہتا تھا۔ اور جب جی چاہتا۔ پھر کملا کے ہاں جانے لگتا۔ بعض دفعہ تو دن میں دو دو دفعہ پہنچ جاتا تھا۔ وہ جب جاتا تھا کملا کی جھولی نوٹوں سے بھر دیتا تھا۔

کملا اس کی ہمدرد ہو گئی تھی۔ اس حالت میں وہ اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھی۔ وہ جان گئی تھی۔ ہاشم کا دل زخمی ہے اس لئے اپنے برتاؤ سے اس کے زخمی دل پر پھاہا رکھنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اس حقیقت کو ہاشم بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ جب اس کے دل کا زخم بار بار رسنے لگتا تھا۔ تو وہ دوڑ دوڑ کر کملا کے پاس آتا تھا۔ وہ اپنی باتوں اپنی خدمت اور اپنی بے لوثی کا پھاہا اس کے زخمی دل پر رکھ دیتی۔ وہ سکون سا محسوس کرنے لگتا۔ تب دل کی ٹیک کچھ کم ہو جاتی۔ وہ آگ سی جو بھڑک رہی تھی اس کے سینہ میں اس کے شعلے مدھم پڑ جاتے۔ وہ غم سے چور ہو کر صدمہ سے نڈھال ہو کر کملا کے

پاس اس طرح آتا تھا جیسے بھوک سے بے حال بچہ ماں کی گود میں پہنچ جائے اور ہمک ہمک کر اس کا دودھ پینے لگے۔ وہ جب یاس کے غلبہ اور ناکامی کے صدمہ سے از خود رفتہ ہو جاتا تھا تو اس کے قدم خود بخود کملا کے گھر کی طرف اٹھنے لگتے تھے۔ اسے یقین تھا۔ میں وہاں پہنچا اور دل کی ٹیس کم ہوئی وہ درد جو اندر ہی اندر تمام کئے دے رہا ہے۔ وہاں پہنچتے ہی ختم ہو جائے گا۔

سر کا درد اسپرین کھاتے ہی زائل ہو جائے گا۔ لیکن جائے گا نہیں۔ جب تک اسپرین کا اثر رہے گا۔ درد دبکا پڑا رہے گا۔ جب اس کا اثر زائل ہو جائیگا۔ وہ پھر اس طرح دبوچ لے گا۔ جس طرح شیر بکری کو دبوچ لیتا ہے۔

کملا اس کے درد کی فوری تسکین تھی۔ جب تک وہ اس کے دامن سے لپٹا رہتا تھا اس کا کرب اس کی خلش اس کا اضطراب رکا رہتا تھا۔ جب وہ وہاں سے ہٹتا تھا تو کرب پھر اس کے پاس واپس آ جاتا تھا۔ خلش پھر محسوس ہونے لگتی تھی۔ اضطراب پھر دل کے گوشہ گوشہ میں اپنا نشیمن بنا لیتا تھا۔

ایک روز وہ کملا کے پاس کئی روز کے بعد آیا۔ چہرہ اترا ہوا کپڑے میلے۔ سر کے بال الجھے ہوئے۔ جوتا پھٹا ہوا۔ کملا اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دروازہ حسب معمول اندر سے بند کر لیا اور اس سے باتیں کرنے لگی۔

"آج تو بہت دکھی دکھائی دے رہے ہو بابو جی!"

"ہاں ہے کچھ ایسی ہی بات"

"مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

"کیا کرو گی سن کر تم"

"کچھ دل ہی ہلکا ہو جائے گا"

"روپے لایا تھا، سب خرچ ہو چکے۔ منشی کو دو تار بھیج چکا ہوں۔ اب تک اس نے روپیہ نہیں بھیجا۔ نہ معلوم کیا بات ہے۔ ہوٹل کا بل بھی چڑھ گیا ہے اور راموکو دینے کے لئے تمہاری فیس بھی نہیں ہے۔ اس کے سو روپے فیس کے میرے اوپر چڑھ چکے ہیں۔ اب سختی سے تقاضہ کرنے لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہیں اور چلا جاؤں۔"

"میں تو نہیں جانے دوں گی بابو جی"

"بے پیسہ کوڑی یہاں رہوں گا کیسے؟"

"مجھ سے لو"

(ہنس کر) "کیا ہے تمہارے پاس؟"

"ابھی لاتی"

یہ کہہ کر وہ اٹھی۔ بغل کو ٹھڑی میں گئی۔ وہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس کے پائے تلے اس نے ایک پڑیا رکھ دی تھی۔ فوراً وہی پڑیا اٹھا لائی اور ہاشم کے سامنے رکھ دی۔

"یہ لو"

ہاشم نے پڑیا کھولی۔ تو سو سو کے تین نوٹ اور دس دس کے سو ڈیڑھ سو نوٹ نکل آئے اس میں سے۔

ہاشم کو بڑا اچنبھا ہوا۔ اس نے کہا۔

"یہ تو کئی ہزار روپے ہیں"

"آپ ہی کے تو ہیں"

ہاشم کو یاد آگیا۔ سو سو کے اور دس دس کے نوٹ وہی اس پر نچھاور کیا کرتا تھا۔

اس نے کہا۔

"تم نے ان میں سے کچھ خرچ نہیں کیا؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"لے جائیے یہ روپے۔ قرضہ ادا کر دیجئے سب۔ لیکن......؟"

"ہاں ہاں کہو"

"اب کہیں جانے کا نام نہ لیجئے گا؟"

"کیا تم مجھے چاہتی ہو؟"

کملا نے گردن جھکا لی۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔ ہاشم نے کہا۔

"کملا تم ایسے آدمی سے محبت کرتی ہو۔ جو کسی سے محبت کر سکتا۔ جو سب کو بھول چکا ہے۔ جو کسی کا نہیں ہو سکتا۔ جو کسی کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ جس سے کوئی خوش نہیں رہ سکتی۔"

یہ کہتے کہتے ہاشم کی آنکھیں بھی ابلتا ہوا چشمہ بن گئیں۔ کملا نے اپنے دامن سے اس کے آنسو پونچھے اور کہا۔

"ارے آپ رو رہے ہیں؟ مت روئیے"۔ یہ کہہ کر وہ خود بھی رونے لگی۔ اس کے بازو پر اپنا سر رکھ کر وہ ہچکیاں لے رہی تھی اور ہاشم اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے منہ کو اپنی انگلیوں سے ٹٹول رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک یہی کیفیت رہی۔ پھر ہاشم نے کہا۔

"کملا! میں اب جاتا ہوں۔ پھر آؤں گا"

"میں ایک بات کہوں؟"

"کہو ضرور کہو"

"مجھے مول لے لیجیے۔ رامو سے"

"مول لے لوں تمہیں؟"

"ہاں مجھے"

"بیچ ڈالے گا رامو تم کو؟"

"ہاں وہ کہہ رہا تھا۔ کوئی اچھا گاہک مل جائے تو کملا کو بیچ کر نیا مال لاؤں گا۔"

"تمہیں مول لے کر کیا کروں گا میں؟"

"میں آپ کی سیوا کروں گی۔ آپ کا بستر بچھاؤں گی۔ آپ کے لیے کھانا پکاؤں گی۔ آپ کے پاؤں دابوں گی۔"

(ہنس کر) ارے اتنے سارے کام کر ڈالو گی تم؟"

"ہاں"

"کیا دام لے گا رامو؟"

"ہزار روپیہ اور کیا؟"

"تو میں آج ہی سودا کیے لیتا ہوں"

کملا کے کمرہ سے ہاشم باہر نکلا۔ تو رامو سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنی مونچھوں کو مکھن کا ناشتہ کرا رہا تھا۔ قبل اس کے کہ رامو کچھ کہے ہاشم اس کے پاس پہنچ گیا۔

"سودا کروگے رامو"

"کیا مطلب آپ کا؟"

"مطلب یہ کہ ہمارا دل کملا سے مل گیا ہے۔ تم بیچ ڈالو ہم لے لیں۔"

"انمول موتی ہے بابو صاحب وہ"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ بتاؤ کیا لوگے؟"

"پورے دو ہزار"

"ہم تو تمہیں پورا ایک ہزار دیں گے۔ اگر منظور ہو تو یہ لو اپنے دام"

یہ کہہ کر سو سو کے دس نوٹ اس نے رامو کے سامنے رکھ دیے۔ رامو نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں کہا۔ کر لے سودا۔ یہ مال پرانا ہو چکا۔ کوئی اور اتنے دام بھی نہیں دے گا۔ اس نے نوٹ اپنی جیب میں رکھے۔ اور کملا کو آواز دی۔

کملا آئی۔ اس نے کہا۔

"کہا سنا معاف کرنا۔ آج سے تم بابو جی کی ہو۔ جاؤ ان کے ساتھ!"

کملا ایک گائے کی طرح نیلام ہوئی اور اپنے نئے مالک کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

ہاشم کملا کو لے کر ہوٹل آیا۔ وہاں نارد لال اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے فارم پر دستخط کرائے اور پانچ ہزار روپے گن دیے۔ ہاشم نے نوٹ اپنی جیب میں رکھے اور کملا کو لے کر اپنے کمرہ میں آ گیا۔

کملا سے ہاشم نے کہا۔

"بڑی بھاگوان نکلیں تم کملا!"

"کیوں بابو جی؟"

"کتنے دن سے میں پریشان ہو رہا تھا۔ آج تم نے بھی میری جھولی بھر دی اور یہ دیکھو منشی جی نے بھی روپے بھیج دیے۔"

کملا چپ چاپ سنتی رہی۔

ہاشم نے پھر کہا۔

"کملا! تم نے میرا انتخاب غلط کیا ہے۔ میں تمہیں سکھ نہیں دے سکونگا۔ میرے دل کی دنیا اجڑ چکی۔ وہ اب آباد نہیں ہو سکتی۔ میرے چاہ کی لہلہاتی ہوئی کھیتی جھلس گئی۔ اب وہ سرسبز نہیں ہوگی۔ ایسے اجڑے گھر میں تم رہ کر کیا کرو گی؟"

"بابوجی مجھے سکھ نہیں چاہیئے۔ میرا سب سے بڑا سکھ یہ ہے کہ آپ کو کچھ سکھ مجھ سے مل جاتے۔ میں آپ کے پاس کوئی آشائے کر نہیں آئی ہوں۔ آپ کی یہ بھول ہے جو آپ ایسا سمجھ رہے ہیں۔"

ہاشم نے کہا۔

"کملا معاف کرو میں تمہیں غلط سمجھا تھا۔ تم تو دیوی ہو۔ ہم تم آج سے بھائی بہن کی طرح رہیں گے۔"

کملا کا چہرہ دمک اٹھا کہنے لگی۔

"ہاں بالکل بھائی بہن کی طرح!"

باب ۲۴

ثریا اور شاہد

ثریا صبح کو دیر تک بستر پر پڑی رہی۔ اسے کچھ کچھ بخار تھا۔ بدن ٹوٹ رہا تھا۔ جمائیاں آ رہی تھیں۔ پہلے اس کا پنڈا ابھی پھیکا ہو جاتا تھا۔ تو گھر ڈاکٹروں اور حکیموں کا عجائب خانہ بن جایا کرتا تھا۔ لیکن آج اس کی بیماری چنداں اہمیت نہ اختیار کر سکی۔ البتہ صنوبر گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی رہی۔ رضیہ نے بھی خبرگیری کی۔ اس نے حکیموں کی طرح نبض دیکھی۔ انتھا ٹیلا اور کچھ خانگی دوائیں بھی استعمال کرائیں۔

امی جان کو بھی یہ خبر صنوبر نے پہنچا دی۔ وہ گٹھیا کے مارے اس کے کمرہ میں جا بھی نہیں۔ البتہ صنوبر کو سخت تاکید تھی۔ کہ وہ دم بدم کی خبریں لاکر دیتی رہے۔ وہ سن چکی تھیں کہ ثریا کو ہلکی سی حرارت ہے پھر بھی امی کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ کسی کام میں ان کی طبیعت نہ لگتی تھی۔

دوسرے روز بخار تو اتر گیا۔ لیکن کمزوری اس درجہ غالب آچکی تھی کہ وہ کالج نہیں جا سکی۔ تین چار روز کے بعد وہ لوٹ پوٹ کے بالکل اچھی ہو گئی۔

آج وہ پھر کالج جا رہی تھی۔ امی جان کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ اب اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے۔ شاکر کی بھی یہ رائے تھی کہ اسے ہرگز کالج نہ جانے دیا جائے اور پردہ میں بٹھا دیا جائے۔ لیکن رضیہ اس فیصلہ کے خلاف تھی۔ اس نے کہا۔ ثریا جبر و جور سے قابو میں آنے والی لڑکی نہیں ہے۔ قانوناً بالغ ہو چکی ہے۔ ایم۔ اے میں پڑھ رہی ہے۔ شادی کی رجسٹری بھی کرا چکی ہے۔ پولیس میں اطلاع دینے اور عدالت میں مقدمہ کرنے کو تیار ہے۔ اس پر جبر کیا جائیگا تو وہ قابو میں نہیں آئے گی۔ معاملہ اور بڑھ جائیگا۔ رسوائی اور زیادہ ہوگی۔ اور وہ ہوگا بھی۔ جو وہ چاہے گی۔ وہ جائیداد میں سے اپنا حصہ بھی لے لے گی۔ اور بنک میں جو پچاس ہزار کی رقم اس کے نام پر اس شرط سے جمع ہے کہ جب اس کی شادی ہو جائے تو اسے دے دی جائے۔ اسے بھی وصول کرے گی۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ منصور اس کا پشت پناہ ہے۔ وہ بھی اکڑا ہوا ہے اور بالکل اس کے ساتھ ہے۔ ثریا بگڑی تو وہ بھی بگڑ جائے گا۔ جائیداد کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ گھر بٹ جائے گا۔ خاندان تباہ ہو جائیگا۔

"ہو جائے" امی جان نے کہا۔

لیکن شاکر کے لئے یہ "ہو جائے" آسان نہیں تھا۔ جائیداد میں سب کا حصہ تھا۔ منصور کا بھی اور ثریا کا بھی مگر مشترکہ خاندان کے رکن اعظم کی حیثیت سے شاکر ہی کرتا دھرتا بنا ہوا تھا۔ وہی ساری آمدنی پر قابض اور متصرف تھا۔ جائداد کے انتظام اور نگرانی کا سارا کام اسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ان باتوں کے لئے جن پر اس کا بس نہیں چل سکتا۔ خواہ مخواہ اپنے اقتدار اپنی غیر محدود آمدنی اور اپنے حد سے بڑھے ہوئے مصارف سے بات آگے

بڑھا کر دست بردار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہی شاکر جو کل رات کو ایک خون آشام اور جابر فرمانروا کی طرح ثریا کو ڈانٹ رہا تھا۔ اس وقت رضیہ کی باتیں سن کر نرم پڑ گیا۔ اس نے کہا۔

"رضیہ سچ کہتی ہے۔ چھوڑو ثریا کو اس کے حال پر۔"

امی جان بھی خاموش ہو گئیں۔ اس وسیع گھر پر جہاں وہ حکمران تھیں۔ ان کی رعایا میں سے کوئی بھی اس بارے میں ان کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا۔ ایسے نازک مواقع بہت کم آتے تھے۔ لیکن جب کبھی آجاتے تھے تو وہ سکوت سخن شناس پر عمل کرتی تھیں۔

ابھی یہ کانفرنس ہو رہی تھی کہ ثریا کالج جاتی ہوئی دکھائی دی۔ شاکر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ امی جان کا خون (بہت کم تھا پھر بھی) کھولنے لگا۔ بڑی قاتل آنکھوں سے ان دونوں نے اسے دیکھا۔ لیکن وہ ایک بے پروائی کے انداز سے آنکھیں نیچے کئے ہوئے نکلی چلی گئی۔

ثریا کالج پہنچی۔ اس کی آنکھوں نے کلاس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ شاہد اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ لیکن بہت دل گرفتہ چہرہ زرد غمگین افسردہ مضمحل۔ ثریا آئی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ ناصر شاہد کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے زور کی چٹکی لی۔ شاہد چونکا۔ اس نے دیکھا ثریا آئی ہے۔

وقفہ کے دوران میں پھر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ ثریا کھچی کھچی سی تھی اور شاہد کی آنکھوں میں وہی اشتیاق جو ہمیشہ جھلکتا رہتا تھا آج بھی جھلک رہا تھا۔ اس نے ایک خاص تاثر کی حالت میں کہا۔

"ثریا اتنے روز کہاں رہیں؟"

"جہنم میں"

"ارے کچھ خفا ہو تم؟"

"آپ کو کیا؟"

"آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"بہت ناگوار ہو رہی ہیں یہ باتیں آپ کو؟"

"تمہاری ہر بات مجھے گوارا ہے لیکن خفگی نہیں!"

"دل ٹوٹ جائے گا آپ کا؟ کیوں؟"

"ہاں ٹوٹا جا رہا ہے وہ؟"

"لیکن دوسروں کا دل بھی تو توڑتے رہتے ہیں آپ!"

"کس کا دل توڑا ہے میں نے؟"

"آپ نے وعدہ کیا تھا۔ پھر کیوں نہیں آئے آپ میری شادی میں!"

"اس کا شکوہ تو میں تم سے کرنے والا تھا!"

"مجھ سے شکوہ کرنے والے تھے آپ؟ کاہے کا؟"

"طے ہو گیا تھا کہ شادی میں آؤں گا میں۔ کہو ہاں!"

"ہاں طے ہوا تھا یہ۔"

"تم نے اپنے گھر کا پتہ بتایا تھا مجھے؟"

"اوہ!"

یہ کہہ کر ثریا مسکرا دی۔ پھر اس نے وار کیا۔

"آپ نے کیوں نہیں پوچھ لیا تھا مجھ سے؟"

"میں پوچھنے والا تھا۔ لیکن تمہاری باتوں میں ایسا کھو گیا کہ بالکل نہ پوچھ سکا۔ ورنہ

اس بارات کا اصلی دولہا تو میں ہی تھا۔ میں ہی نہ آتا بھلا!"

اب ثریا ہنسی۔ شاہد بھی مسکرانے لگا۔ بیگانگی کی جگہ پھر یگانگت نے لے لی۔ بے رخی پھر بے تکلفی پر آتی جا رہی تھی۔

رضیہ نے کہا "پہلے میں جاتی ہوں رانی باغ۔ تھوڑی دیر بعد آپ آ جائیے۔ اس وقت دوپہر کو وہاں تنہائی ہوگی۔ اطمینان سے باتیں کریں گے۔ بہت سی باتیں کرنا ہیں!"

دونوں الگ الگ ہو گئے۔ پہلے ثریا روانہ ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہد۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دونوں رانی باغ پہنچ گئے۔ اسی کنج عافیت میں۔ جہاں اس سے پہلے بھی ایک روز بیٹھے ہوئے یہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔

"ہاں بھئی پہلے اپنی شادی کا قصہ سناؤ اور" شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا کیجئے گا سن کر۔ بڑی دکھ بھری کہانی ہے وہ!"

"کیوں کیا ہوا؟"

ٹھنڈی سانس لے کر "وہی ہوا جو نہ ہونا چاہئے تھا!"

"شادی کر دی گئی تمہاری؟"

"ہاں!"

"کچھ نہ ہو سکا تم سے"

"کیا ہوتا؟ میں اکیلی ایک طرف سارا گھر ایک طرف۔ آپ بھی تو ایسے نازک موقع پر روپوش تھے!"

شاہد پر سکتہ سا چھا گیا۔ معلوم ہوتا تھا وہ بے ہوش ہوا ہی چاہتا ہے۔ ثریا کا سنجیدہ چہرہ پھر باغ و بہار بن گیا۔ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا کر انداز دل ربا

مہابھارت کی جنگ کا ایک ایک صفحہ الٹنا شروع کیا۔ شاہد چپ چاپ سن رہا تھا۔ دنگ ششدر۔ بھونچک۔

ثریا اپنی داستان سنا رہی تھی۔ شاہد کی آنکھیں ثریا کے چہرہ پر گڑی تھیں۔ کان داستان سن رہے تھے۔ اور دماغ سوچ رہا تھا۔ آفرین ہے اس عورت کی ہمت پر۔ اس نے وہ کام کر دکھایا جو بڑے بڑے مرد نہیں کر سکتے۔ ایسے کردار اور ایسے دل کی عورتیں یہ مادر گیتی روز روز نہیں پیدا کرتی۔ صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسی بنات آدم۔

ثریا کی داستان ختم ہوئی۔ شاہد گم صم بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں ثریا کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ ثریا کے چہرہ پر اس وقت اسے نور جلال اور کبریائی کا جلوہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ اس چہرہ کو اٹھا کر اپنے دل میں رکھ لے۔ اب تک وہ ثریا سے محبت کرتا تھا۔ لیکن آج سے وہ اس کا معتقد ہو گیا تھا۔ محبت ختم بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن عقیدت تو جان کے ساتھ جاتی ہے۔ اسے چپ چپ دیکھ کر ثریا نے کہا۔

"کیسا مراقبہ ہو رہا ہے مولانا صاحب!" یہ کہہ کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ وہ جانتی تھی کالج کی لڑکیاں شاہد کو طنز سے مولانا کہا کرتی تھیں۔ اس نے جواب دیا۔

"کمال کر دیا تم نے ثریا!"

"عورت کیا نہیں کر سکتی ہے؟"

"یہ کام تو مردوں سے بھی نہیں ہو سکتا تھا!"

"مرد؟ یہ تو بڑا پرانا پراپیگنڈا ہے۔ قلم دوات ہمیشہ مردوں کے ہاتھ میں رہا کرتے رہے۔ جی بھر کے اپنی تعریف "رفتہ رفتہ "مرد" کے لفظ میں وہ جان ڈال دی کہ وہ عزم طاقت کردار اور استقلال کا مترادف بن گیا۔ اور عورت کو اپنے پراپیگنڈا سے یہ نازک بدن اور

سیمیں تن ثابت کرتے رہے۔ وہ ان کی نظر میں ایک کلی۔ ایک لرزتی ہوئی پتی بن گئی۔

"حالانکہ حقیقت بالکل برعکس ہے۔" یہ کہہ کر شاہد مسکرا دیا۔

"بالکل شاہد صاحب! عورت ایک ایسا جگر ہے جو قدرت کا شاہکار ہے۔ ہاں! عورت پھول کی طرح نرم، کلی کی طرح نازک، نسیم بہار کی طرح لطیف ہے۔ لیکن وہی عورت جب عورت بن جاتی ہے تو اس کی ٹھوکر سے پہاڑ ہل جاتے ہیں۔ چٹانیں اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہیں۔ طوفان اپنا رخ بدل لیتے ہیں۔"

"میں ہرگز قائل نہ ہوتا۔ اس شاعری کا۔ لیکن تم نے اس شاعری کو حقیقت بنا دیا۔ سورج سے زیادہ روشن اور تابناک حقیقت!"

"شکریہ! آداب بجا لاتی ہوں۔"

"ثریا! آج تو عجیب عجیب باتوں کا انکشاف ہو رہا ہے۔ مجھے قطعاً نہیں معلوم تھا۔ کہ تم شاکر صاحب کی بہن ہو۔ میں تم سے محبت کرتا تھا۔ تمہارے حسب نسب کی مجھے کیا ضرورت تھی۔ مجھے ہرگز اس کی امید نہیں تھی۔ کہ ایسے عالی خاندان کی لڑکی یہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی کہ جس سے محبت کر رہی ہے۔ وہ ایک طوائف کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ ایک طوائف کے گھر میں پلا بڑھا ہے۔ محبت کرتی رہے گی؟"

"وہی بات"

"کیا؟"

"میں نے محبت تم سے کی تھی۔ مجھے تمہارے حسب نسب کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے کبھی یہ معلوم کرنا نہیں چاہا کہ تم امیر ہو یا غریب۔ شریفوں کی اصطلاح میں شریف ہو یا رذیل۔ میں نے ایسے ایسے شریف رذیل دیکھے ہیں۔ کہ اگر ان کے چہرہ کا نقاب الٹ دیا جائے

زندگی گھن کھا کر ختم کر دے۔ اور میں نے ایسے ایسے رذیل اشراف بھی دیکھے ہیں۔ انسانیت جن پر ناز کرتی ہے۔"

شاہد خاموشی سے سن رہا تھا۔ ثریا نے کہا۔

"میں نے تمہیں دیکھا۔ تم سے پہلے بہت سے لوگوں کو میں دیکھ چکی تھی۔ لیکن تم میں کوئی خاص بات تھی۔ جس سے میرا دل متاثر ہوا۔ پھر میں نے تمہیں پرکھا۔ اور پرکھ کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ میں تم سے محبت کرنے لگی۔"

شاہد اب بھی خاموش تھا۔ ثریا کا سلسلۂ سخن جاری تھا۔

"میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں۔ جن کے پاؤں ڈانواڈول ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں ہوں جن کا بڑھا ہوا قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔ نہ سماج کے ڈر سے، نہ خاندان کے خوف سے نہ ماں اور بھائی کے دباؤ سے میرا امتحان ہوا۔ اور ان سب مرحلوں سے میں گذر گئی۔"

شاہد نے کہا۔

ثریا ذرا اپنی اسی جاں نواز لے میں جو صرف تمہارا حصہ ہے۔ یہ شعر تو گاؤ۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

ثریا پر نسائیت کا حجاب غالب آ گیا۔ اس نے کہا۔

"ہٹو ہمیں نہیں اچھی لگتیں یہ باتیں۔"

تھوڑی دیر تک دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر شاہد نے کہا۔

"اب کیا ہوگا؟"

"کیا رائے ہے تمہاری؟"

شرعاً اور قانوناً ہم میاں بیوی ہیں۔ بلکہ (مسکرا کر) "رجسٹرڈ" میاں بیوی ہیں لیکن اتنے قریب رہ کر بھی ہم کب تک ایک دوسرے سے دور رہیں گے؟"

میری رائے تو یہ ہے کہ ایک سال اور گذر جانے دو۔ تم بھی ایم اے کر لو اور میں بھی۔ پھر ہم تم دونوں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنی دنیا سب سے الگ ہو کر بسائیں۔ ویسے میرا جائداد میں بھی حصہ ہے۔ گھر میں بھی ہے۔ میرے نام میرے ابا جان پچاس ہزار بینک میں بھی جمع کر گئے ہیں۔ ان سب سے میں فائدہ اٹھا سکتی ہوں اور اٹھاؤں گی۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ ہماری زندگی۔ میرے آبائی ترکہ اور ورثہ کے سہارے پر شروع ہو۔ میں اس کی پرواہ نہیں کرتی۔ کہ دنیا ہمیں کیا کہے گی۔ وہ کچھ کہتی ہی رہے لیکن اپنی یہ سب چیزیں لیکن میں سب پر یہ ثابت کر دینا چاہتی ہوں کہ اگر یہ کچھ نہ ہوتا یا کوئی ایسی صورت ہوتی۔ کہ میں ان سب چیزوں سے محروم کی جا سکتی۔ ہوتی تب بھی ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنی دنیا بسا سکتے تھے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر پہلے ہم دنیا بسا لیں۔ پھر بینک اور جائیداد کی جنت ہمیں زیادہ لطف دے گی۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"وہی جو تم"

"مجھے تو خوب ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے۔"

ثریا نے کہا

"بڑے شعر یاد کر لئے ہیں۔"

"شعر کہاں تھے ابھی تم نے۔ یہ تو صرف ایک مصرعہ تھا۔ سنو گی شعر؟"

"معاف کرو۔ کالج کا وقت ختم ہو گیا۔ اب میں جاتی ہوں گھر۔ پھر کبھی ہوگا

مشاعرہ!

دونوں ساتھ ساتھ اُٹھے۔ اور اپنی اپنی راہ ہو لئے۔

---

rekhta

باب ۲۵

لتاڑ

ثریا کے حادثہ نے شاکر کے دل و دماغ کو بہت صدمہ پہنچایا تھا۔ رضیہ کے مشورہ کے مطابق وہ مصلحتاً خاموش تھا۔ لیکن اس کے دل میں غصّہ کا تنور گرم تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ منصور اور ثریا دونوں کا خاتمہ کر دیتا۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ دانت پیس کر رہ جاتا تھا۔

اس عرصہ میں وہ یاسمین کے ہاں بھی نہ جا سکا۔ جب انسان فکرمند ہو تو عیاشی میں لطف نہیں آتا۔ ؎

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

یہی وجہ تھی کہ یاسمین کا عشرت کدہ بھی اُسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا۔ چند روز میں گھر کی ان تازہ الجھنوں کا وہ عادی ہو گیا۔ اب اسے تفریح کی سوجھی۔ لیکن پہلی اور

rekhta

سیدھا یاسمین کے بالا خانہ پر پہنچ گیا۔

یاسمین نے دیکھتے ہی ٹانگ لی۔

"کہاں بھول پڑے سرکار ادھر آج؟"

"اتنا تعجب کیوں ہے؟"

"میں کہتی شاید رستہ بھول گئے ہو آپ؟"

"کیوں، کہیں تم یہ؟"

"اتنے روز سے کہاں تھے؟"

"تھیں کچھ ایسی ہی خانگی مصروفیتیں اور ان سے زیادہ پریشانیاں۔"

"پریشانیاں بھی؟ کیا ہوا کیا؟"

"چھوڑو اس قصے کو۔"

"بندی تو سن کر رہے گی سرکار۔"

"کیا کرو گی یہ دکھڑا سن کر۔"

"یہ تو دشمن پریشان ہوں۔ اور میں یہ بھی نہ پوچھوں؟ پھر میں دوا کس مرض کی ہوتی؟"

شاکر نے یاسمین کو سارے واقعات بتا دیئے۔ وہ بہت غور و توجہ سے یہ داستان سن رہی تھی۔ پھر اس نے پاندان اپنی طرف کھینچا۔ پہلے ایک پان کا بیڑا بنا کر خود کھایا۔ پھر دوسرا بیڑا شاکر کی طرف "ہوں" کہہ کر بڑھایا۔ وہ پاندان بند کرتے کرتے کہنے لگی۔

"واللہ قسم تم بھی نرے ویسے ہی رہے؟"

"بڑی اچھی پہیلی بجھا گئیں تم۔ یہ ویسے کیا پھیر ہوتی ہے؟"

"تو اور کیا کہوں۔ غضب خدا کا۔ جوان جہان بہن تمہاری آنکھوں دیکھتے رنڈی بچہ

سے بیاہ رچا لے۔ اور تم کچھ نہ کر سکو۔ اے میں کہتی ہوں تمہاری غیرت کیا ہو گئی تھی۔ مار کیوں نہ ڈالا تم نے بہن کو؟"

"وہ بڑی زیرک ہے۔ اس نے ایسا بندوبست کر لیا تھا کہ میں ذرا بھی زیادتی کرتا تو میرا گھر پولیس چوکی بن جاتا۔"

"چلو ہٹو بھی۔ بس باتیں بنانا کوئی ان سے سیکھے۔ ہوتا ہوتا تو میاں سے کچھ ہے نہیں۔ بے بات کی باتیں جتنی چاہو سن لو۔"

"پھر وہ نالائق منصور بھی تو اس کا پشت پناہ تھا۔"

"بھاڑ میں گیا منصور اور چولہے میں گئی ثریا۔ اور سنو۔ اب شریف بیٹیاں خود اپنا بر چنیں گی۔ خود تاک جھانک کر مرد وہ پسند کریں گی۔ اور کہیں اور بھی نہیں رنڈی بچوں سے بیاہ کریں گی۔ موئی زمین بھی نہیں پھٹ جاتی۔ اللہ بچائے ان لوگوں سے یہ سب قیامت کی علامتیں ہیں۔ میں کہتی ہوں۔ اس سے پہلے بھی تم نے سنا تھا کہ کہیں ایسا ہوا ہو۔ بھئی ہم جھوٹ کیوں بولیں۔ ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں۔ ہم رنڈی ہم شریفوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ان کا ہمارا میل کیا؟"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا۔"

"کہہ رہے تھے خاک۔ تم نے وہ ناک کٹائی ہے خاندان کی کہ توبہ بھلی۔ میں سوچتی ہوں تو بدن میں سنسنی ہونے لگتی ہے۔ ہائے میرے اللہ شاکر میاں کی ماں جائی زہرہ کے گھر جائے گی۔ اس کے بھائی کا پھلوا گرم کرے گی۔ اس کی ماں کی بہو بنے گی۔ وہ شریف زادی جس کے دامن پر حوریں نماز پڑھیں۔ ایسی گئی گذری ہوئی کہ موئے شاہد کے پلے باندھ دی گئی۔ توبہ ہے میرے اللہ (اللہ) توبہ!"

سیدھا یاسمین کے بالا خانہ پر پہنچ گئی۔

یاسمین نے دیکھتے ہی ٹانگ لی۔

"کہاں بھول پڑے سرکار ادھر آج؟"

"اتنا تعجب کیوں ہے؟"

"میں کچھ شاید رستہ بھول گئے آپ؟"

"کیوں بھیس تم یہ؟"

"اتنے روز سے کہاں تھے؟"

"تھیں کچھ ایسی ہی خانگی مصروفیتیں اور ان سے زیادہ پریشانیاں۔"

"پریشانیاں بھی؟ کیا ہوا کیا؟"

"چھوڑو اس قصے کو"

"بندی تو سن کر رہے گی سرکار"

"کیا کرو گی یہ دکھڑا سن کر"

"یہ تو دشمن پریشان ہوں۔ اور میں یہ بھی نہ پوچھوں؟ پھر میں دوا کس مرض کی ہوتی؟"

شاکر نے یاسمین کو سارے واقعات بتا دیے۔ وہ بہت غور و توجہ سے یہ داستان سن رہی تھی۔ پھر اس نے پاندان اپنی طرف کھینچا۔ پہلے ایک پان کا بیڑا بنا کر خود کھایا۔ پھر دوسرا بیڑا شاکر کی طرف "ہوں" کہہ کر بڑھایا۔ وہ پاندان بند کرتے کرتے کہنے لگی۔

"واللہ تم تم بھی نرے ویسی رہے؟"

"بڑی اچھی پہیلی بجھا گئیں تم۔ یہ ڈری کیا پھیر چلتی ہے؟"

"تو اور کیا کہوں۔ غضب خدا کا جو ان جہاں بہن تمہاری آنکھوں دیکھتے رنڈی بچہ

سے بیاہ رچالے۔ اور تم کچھ نہ کر سکو۔ اے میں کہتی ہوں تمہاری غیرت کیا ہو گئی تھی۔ مار کیوں نہ ڈالا تم نے بہن کو؟"

"وہ بڑی زیرک ہے۔ اس نے ایسا بندوبست کر لیا تھا کہ میں ذرا بھی زیادتی کرتا تو میرا گھر پولیس چوکی بن جاتا۔"

"چلو ہٹو بھی۔ بس باتیں بنانا کوئی ان سے سیکھ لے۔ ہوتا ہواتا تو میاں سے کچھ ہے نہیں۔ بے بات کی باتیں جتنی چاہو سن لو۔"

"پھر وہ نالائق منصور بھی تو اس کا پشت پناہ تھا۔"

"بھاڑ میں گیا منصور اور چولھے میں گئی ثریا۔ اور سنو۔ اب شریف بیٹیاں، خود اپنا بر چنیں گی۔ خود تاک جھانک کر مرد وہ پسند کریں گی۔ اور کہیں اور بھی نہیں رنڈی بچوں سے بیاہ کریں گی۔ موئی زمین بھی نہیں پھٹ جاتی۔ اللہ بچائے ان لوگوں سے یہ سب قیامت کی علامتیں ہیں۔ میں کہتی ہوں۔ اس سے پہلے بھی تم نے سنا تھا کہ کہیں ایسا ہوا ہو۔ بھئی ہم جھوٹ کیوں بولیں۔ ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں۔ ہم رنڈی، ہم شریفوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ان کا ہمارا میل کیا؟"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا۔"

"کہہ رہے تھے خاک۔ تم نے وہ ناک کٹائی ہے خاندان کی کہ توبہ بھلی۔ میں سوچتی ہوں تو بدن میں سنسنی ہونے لگتی ہے۔ ہائے میرے اللہ شاکر میاں کی ماں جائی زہرہ کے گھر جائے گی۔ اس کے بھائی کا پھلوا گرم کرے گی۔ اس کی ماں کی بہو بنے گی۔ وہ شریف زادی جس کے دامن پر جو رب نماز پڑھیں۔ ایسی گئی گذری ہوئی کہ موئے شاہد کے پلے باندھ دی گئی۔ توبہ ہے میرے اللہ اللہ، توبہ!"

"کیوں نہیں مانوں گا"

"تو سنو۔ مار سے بھوت بھاگتا ہے۔ وہ چار چوٹ کی مار مارو کہ ثریا کے حواس درست ہو جائیں۔ وہ دو دن میں ایک کاغذ پر لکھ دے اس سے کہ شاہد زبردستی کر کے اسے رجسٹرار کے پاس لے گیا تھا۔ نکاح بھی ٹوٹ جائے گا۔ عزت بھی بچ جائے گی۔ آگے تم جانو تمہارا کام۔ میں کون پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے والی۔ اے ہاں۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان"۔

فرض کرو۔ ایسا کیا میں نے پھر بھی تو معاملہ نازک ہے"

(تیوری چڑھا کر) "میں بھی تو سنوں۔ وہ نزاکت ذرا"

"اگر یہ بیان مار پیٹ کر میں ثریا سے لے بھی لوں تو بھی معاملہ عدالت تک جائے گا۔ رسوائی اور زیادہ ہوگی۔ پھر فیصلہ ہوگا ثریا کے بیان پر وہ ٹھہری ایک خود سر اور ضدی۔ عدالت کے کٹہرہ میں وہ بالکل آزاد ہوگی۔ اگر اس نے بیان بدل دیا۔ تو رہی سہی ناک بھی کٹ جائے گی"

"بھئی میں نہیں جانتی۔ تم جانو تمہارا کام"

"تو خفا ہو گئیں ذرا میں"

"باتیں ہی ایسی کرتے ہو۔ اتنا ڈرپوک بھی کوئی نہیں ہوگا۔ چھوٹی بہن کے ڈر سے پتہ نی ہوا جا رہا ہے میاں کا"

"تم تو بھی خاصی پاگل ہو۔ یہاں ڈرتا کون ہے؟ سوال صرف یہ ہے کہ اگر یہ تدبیر پڑی تو میں منہ دکھانے کے قابل رہوں گا کسی کو؟"

"کیوں نہیں رہوگے۔ کیا کسی کی بہن بیٹی بھگا کے لئے جا رہے ہو؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اچھا ایک تدبیر اور سوچ لی ہے میں نے"

"وہ کیا؟"

"یہ کہ میں انور کو ڈھرے پر چڑھاتی ہوں"

"کیا کرے گا وہ؟"

"جو کسی سے نہ بن پڑے"

"یعنی"

"جو سلوک تم ثریا سے کرو گے۔ وہی سلوک انور شاہد سے کرے گا۔ اتنا مارے گا بچہ کو کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ پھر لکھتے ہی بنے گی اسے خارج خلع کی۔ ہنسی کھیل ہے۔ میرے انور کا مقابلہ کرنا"

"کرے گا یہ کام انور؟"

"کیسے نہیں کرے گا۔ لالچ بری بلا ہے"

"ہاں میں اس کا منہ میٹھا کروں گا"

"اس لالچ میں وہ نہیں آنے کا"

"پھر؟"

"اسے دوسرے قسم کی لالچ دینی پڑے گی"

"آخر کیا؟"

"ثریا"

"میں نہیں سمجھا"

"توبہ الٰہی۔ کیسی الٹی سمجھ ہے تمہاری۔ کچھ سمجھتے ہی نہیں"

"کیوں نہیں مانوں گا"

"تو سنو۔ مار سے بھوت بھاگتا ہے۔ وہ چار چوٹ کی مار مارو کہ ثریا کے حواس درست ہو جائیں۔ وہ دو ہیں ایک کاغذ پر لکھ دو۔ اس سے کہ شاہد زبردستی کر کے اسے رجسٹرار کے پاس لے گیا تھا۔ نکاح بھی ٹوٹ جائے گا۔ عزت بھی بچ جائے گی۔ آگے تم جانو تمہارا کام۔ میں کون پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے والی۔ دے ہاں۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان"۔

"فرض کرو۔ ایسا کیا میں نے پھر بھی تو معاملہ نازک ہے؟"

(تیوری چڑھا کر) "میں بھی تو سنوں۔ وہ نزاکت ذرا"

"اگر یہ بیان مار پیٹ کر میں ثریا سے لے بھی لوں تو بھی معاملہ عدالت تک جائے گا۔ رسوائی اور زیادہ ہوگی۔ پھر فیصلہ ہوگا ثریا کے بیان پر وہ ٹھہری ایک خود سر اور ضدی۔ عدالت کے کٹہرہ میں وہ بالکل آزاد ہوگی۔ اگر اس نے بیان بدل دیا۔ تو رہی سہی ناک بھی کٹ جائے گی"

"مجھی میں نہیں جانتی۔ تم جانو تمہارا کام"

"تو خفا ہو گئیں ذرا میں"

"باتیں بچوں جیسی کرتے ہو۔ اتنا ڈرپوک بھی کوئی نہیں ہوگا۔ چھوٹی بہن کے ڈر سے پتہ نی ہوا جا رہا ہے میاں کا"

"تم تو بھی خاصی پاگل ہو۔ یہاں ڈرتا کون ہے؟ سوال صرف یہ ہے کہ اگر یہ تدبیر پڑی تو میں منہ دکھانے کے قابل رہونگا کسی کو؟"

"کیوں نہیں رہوگے۔ کیا کسی کی بہو بیٹی بھگا کے لئے جا رہے ہو؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اچھا ایک تدبیر اور سوچ لی ہے میں نے"

"وہ کیا؟"

"یہ کہ میں انور کو دھرے پر چڑھاتی ہوں"

"کیا کرے گا وہ؟"

"جو کسی سے نہ بن پڑے"

"یعنی"

"جو سلوک تم ثریا سے کرو گے۔ وہی سلوک انور شاہد سے کرے گا۔ اتنا مارے گا بچو کو کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ پھر لکھتے ہی بنے گی اسے خارج خلعی کی۔ ہنسی کھیل ہے میرے انور کا مقابلہ کرنا"

"کرے گا یہ کام انور؟"

"کیسے نہیں کرے گا۔ لالچ بری بلا ہے"

"ہاں میں اس کا منہ میٹھا کرونگا"

"اس لالچ میں وہ نہیں آنے کا"

"پھر؟"

"اسے دوسرے قسم کی لالچ دینی پڑے گی"

"آخر کیا؟"

"ثریا"

"میں نہیں سمجھا"

"توبہ الہی۔ کیسی الٹی سمجھ ہے تمہاری۔ کچھ سمجھتے ہی نہیں"

"اب علاج یہ ہو جائے گی۔ کہ شاہد کا کانٹا نکل دے۔ ورنہ سے پھر بن جا ثریا کا دولہا"

"کھائی ہے گر سے جندتیں۔ شاہد کے بعد انور"

"پھر وہی بچپن کی باتیں"

"تو سمجھاؤ نا"

"ارے ناچ دوں گی انور کو۔ کچھ بیاہ تو نہیں کرونگی۔ سچ سچ ثریا کا اس سے"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

"تو کروں انور سے بات؟"

"ضرور کرو"

"سچ مچ؟"

"ہاں بالکل"

"اور تم گھر جا کر کیا کرو گے؟"

"وہی جو تم نے بتا دیا ہے۔ مزاج درست کرونگا۔ اس ننگِ خاندان ثریا کا"

"اب آتے مردی پہ۔ وہ بھی کوئی مرد ہے جو عورت سے ڈر جائے؟"

(مسکرا کر) "تو سے ڈرا کروں عورت سے؟"

(خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ) "نہ وقت دیکھو نہ بے وقت کرنے لگے چھیڑ چھاڑ"

"تم بھی تو عورت ہو آخر"

"تو؟"

"نہ ڈرا کروں تم سے؟"

(آنکھیں نیچی کر کے) "میری ایسی عورت کوئی ہو تو نہ!"

"ہاں بھئی یہ ٹھیک ہے۔ پھر تو ڈرا کریں گے تم سے"

یہ کہہ کر شاکر نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

"لاؤ ایک پان دو۔ چلیں پھر"

"جاؤ گے کہاں"

"گھر"

"ابھی سے"

"اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ ابھی جاؤنگا گھر اور ابھی تمہاری بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کرونگا۔ تم بھی انور کو اچھی طرح سکھا پڑھا دو۔ کل ہی وہ بھی اپنے پروگرام پر عمل کر ڈالے!"

"اطمینان رکھو۔ یہی ہوگا!"

اس گفتگو کے دوران میں پان بنانے کا سلسلہ جاری تھا۔ یاسمین نے شاکر کو پان دیا۔ اس نے بیڑہ منہ میں رکھا۔ اور چل دیا گھر کی طرف۔

اس کے جانے کے بعد یاسمین نے آواز دی۔ ستارہ!

ایک دس برس کی چھوکری آنکھیں ملتی ہوئی سامنے آ کر کھڑی ہو گئی

ہر وقت نیند بھری رہتی ہے۔ سالزادی کی آنکھوں میں ابھی گیارہ بجے ہیں رات کے اور نواب زادی صاحبہ نے آرام شروع کر دیا۔ یاسمین گرجی۔

ستارہ نے اس طرح گویا۔ یاسمین کی باتیں سنی ہی نہیں پوچھا۔

"کیا کام ہے بی بی جی!"

"جا انور کو بلا لا!"

تھوڑی دیر میں ایک نوجوان اعلیٰ درجہ کی ریشمی لنگی باندھے بے آستین کا بنیان پہنے مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا۔ اچھی جوانی اور کس بل پر ناز کرتا ہوا سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ یہی انور تھا۔

یاسمین نے ستارہ سے جو انور کے ساتھ ساتھ آئی تھی۔ بڑی حقارت سے کہا چل ہٹ انور سے کہا۔ آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔

انور اور یاسمین میں بڑی دیر تک سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ یاسمین مسکرا کر کچھ اس کے کان میں کہہ رہی تھی۔ اور انور ہنس ہنس کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔

بڑی دیر کے بعد دونوں بھائی بہن جدا ہوئے۔ جاتے جاتے انور نے کہا۔

"یہی ہوگا"

اور وہ چلا گیا

باب ۲۶

ہو گئی شاخ صنوبر بارور

شاکر یاسمین کے ہاں سے سیدھا گھر روانہ ہوا۔ یاسمین نے اسے ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ ایک نئے رود سے آشنا کر دیا تھا۔ ایک نیا راستہ سمجھا دیا تھا۔ یاسمین کی باتیں اس کے لئے جام شراب ثابت ہوئیں۔ شراب پینے کے بعد بزدل بھی مرد بن جاتا ہے یاسمین کی باتوں سے شاکر میں نئی مردانگی آ گئی۔ اس کی مردانگی کھوئی ہوئی تھی۔ یاسمین نے اسے شیر غراں بنا دیا۔ اس کی ہمت مردانہ دل کے کسی گوشہ میں دبکی پڑی تھی۔ نئی نویلی دلہن کی طرح شرماتی ہوئی۔ لجاتی ہوئی لیکن اب وہ بیدار تھی۔ اب وہ رستم داستان یار کی ہم پلہ ہو گئی تھی۔ وہ اپنے تئیں ثریا اور منصور کے سامنے بالکل بے بس پا رہا تھا۔ لیکن یاسمین کی بدولت اب اس کا کس بل دیکھنے کے قابل تھا۔ اس وقت وہ جلال مردانہ اور سطوت شاہی کا پیکر بنا ہوا تھا۔ جس کے سامنے ہر بغاوت کچل دی جاتی ہے ہر سرکشی روند ڈالی جاتی ہے۔ ہر خودسری قتل کر دی جاتی ہے۔ اب وہ ہیچ میرز شاکر نہیں تھا۔ اب وہ سکندر اعظم تھا جو پورس کو شکست

دیتے اور اس کے قلعہ پر اپنے عزم مردانہ اور جرأت رندانہ کا لشکر لے کر چڑھا جا رہا تھا۔

اس کے قدم تیز تیز بڑھ رہے تھے۔ وہ راستہ بھر رضیہ اور یاسمین کا مقابلہ کرتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کتنی بودی ہے رضیہ ڈر گئی کم بخت! کتنی دلاور ہے یاسمین۔ مجھے اچھالا اور اپنے سگے بھائی تک کو خطرہ میں ڈال دیا۔ حالانکہ یاسمین کے مقابلہ میں رضیہ کو کہیں زیادہ میری اور میرے خاندان کی عزت اور عظمت کا پاسبان ہونا چاہئے تھا۔ رضیہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور یاسمین تن کے کھڑی ہو گئی۔ تیر و کمان لے کر۔ یہ وجہ ہے کہ رضیہ میرے دل سے اتر گئی اور یاسمین اس کی مختار مطلق بن گئی۔ یہ بات تو زہرہ میں بھی نہیں تھی۔ زہرہ نے تو خود پیام دیا تھا۔ شاید ثریا کے ساتھ۔ حرامزادی کہیں کی۔ ہو نہ ہو یہی نقش بیاہ رچانے اپنے بھائی کا بیری بہن سے۔

"اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے!"

بہو بنا کر لائیں گی ثریا کو۔ اب معلوم ہو جائے گا آٹے دال کا بھاؤ۔

دل سے یہی باتیں کرتا۔ نئی نئی اسکیمیں بناتا اور نئے نئے فیصلے کرتا غصہ میں بھرا ہوا تیوریاں چڑھاتے ہوئے شاکر گھر میں داخل ہوا۔ اس نے سوچا تھا گھر پہنچتے ہی اپنی عدالت عالیہ کے اجلاس کو دیہات کے تھانہ دار کا کمرہ بنا دے گا۔ جہاں اقبال جرم اور اعتراف خطا کے لئے گنہگاروں اور بے گناہوں کو اتنا مارا جاتا ہے۔ کہ وہ لہولہان ہو جاتے ہیں۔ اور وہی کہتے ہیں جو تھانہ دار صاحب کی مرضی ہوتی ہے۔ لیکن گھر میں داخل ہونے کے بعد اسے ایک عجیب قسم کا ہنگامہ سنائی دیا۔

ہنگامہ کا مرکز صنوبر کی کوٹھڑی تھی اور سارا گھر وہیں جمع تھا۔ امی جان بھی۔ رضیہ بھی۔ ثریا بھی۔ صنوبر کے کمرہ سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ رو رہا ہو۔ شاکر

کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ بھی اس مجمع میں آکر شریک ہو گیا۔ امی جان کے منہ سے جھاگ کا فوارہ اڑ رہا تھا۔ ان کی آواز بڑھاپے کے باوجود سامعہ خراش حد تک بلند ہو رہی تھی۔ ان کے ایک ہاتھ میں بید تھا اور وہ پوری شقاوت اور بے دردی سے صنوبر پر مشق ستم کر رہی تھیں۔ مارتی جاتی تھیں اور پوچھتی جاتی تھیں۔

"بول حرامزادی کس کا ہے یہ بچہ"

صنوبر کرب۔ تکلیف اور اضطراب کے عالم میں ہر نئی ضرب شدید پر مچھلی کی طرح لوٹنے لگتی۔ لیکن اس کے منہ پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ مار کھا کھا کر رو رہی تھی۔ لیکن وہ راز جسے دریافت کرنے کے لئے امی جان ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہی تھیں۔ اس کے منہ میں بند تھا۔ اس کی اس خاموشی سے امی جان کا غصہ اور بڑھ رہا تھا۔ آخر عاجز آکر انہوں نے پہلے سوال پھر مار کا سلسلہ بند کیا اور بیک وقت دونوں کام شروع کر دیئے۔ وہ بے تحاشا صنوبر کو مارنے لگیں۔ "بول یہ کس کا تخم ہے؟" بول یہ کس کا بچہ ہے؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر اپنا سوال دہراتی رہیں۔ شاکر ہکا بکا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ معاملہ کیا ہے۔ کیا صنوبر کے بچہ ہو گیا۔ کہیں ہو سکتا ہے ایسا؟ شاکر ان گتھیوں کو حل کر رہا تھا کہ آخر شور دیکھ کر منصور گھر میں داخل ہوا۔ سب اس سے خفا تھے سب اس سے نالاں تھے۔ سب کی آنکھوں میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ لیکن سب اس سے کھچے کھچے سے رہتے تھے۔ سب اس سے گھبراتے تھے۔ اسے آتے دیکھ کر خود بخود کائی کی طرح مجمع پھٹ گیا۔ اور بغیر کسی زحمت کے وہ صنوبر کی کوٹھڑی میں پہنچ گیا۔ صنوبر اپنی گدڑی پر لہولہان۔ زار و نزار۔ بیمار و ناتواں۔ کمزور اور مضمحل پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک نوزائیدہ بچہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رو رہا تھا۔ اور امی جان اس سے اقبال جرم کرانے کے لئے بے محابا اسے

مار رہی تھیں۔ امی جان کو اس پر غصہ نہیں تھا۔ کہ صنوبر کنوارپنے میں ایک بچے کی ماں کیسے بن گئیں۔ بلکہ انہیں اس راز کے معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ یہ سوغات ہے کس کی؟ وہ کون دیدہ دلیر ڈاکو تھا جس نے ان کے حصار میں آکر ڈاکہ ڈالا۔ اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ آج تک اس گھر میں کوئی واقعہ اس طرح کا نہیں ہوا تھا۔ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ صنوبر کی طرح اب دوسری باندیاں بھی ادھمانے لگیں گی۔ پھر کیا ہوگا اچھا خاصہ حرامی بچوں کا بورڈنگ بن جائے گا یہ گھر۔

منصور نے بڑی ملائمت کے ساتھ امی جان سے پوچھا۔

"کیوں مار رہی ہیں آپ اسے؟"

"دیکھ تو رہے ہو اپنی آنکھوں سے۔ بی بنو خیر سے ایک جیتے آفتاب چندے ماہتاب بچے کی ماں بن گئیں۔ اور یہاں کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ کیا کھیل کھیلے جا رہے ہیں... ... بالزادی حرافہ......"

یہ کہہ کر پھر انہوں نے مارنے کے لئے چھڑی اٹھائی۔ منصور نے چھڑی اپنے ہاتھ پر روک لی۔ پوچھا۔

"کیا کہتی ہے یہ کس کا ہے یہ بچہ؟"

"یہی تو نہیں بتاتی سور کی بچی! میں اسے مار ڈالوں گی۔ لیکن پوچھ کر رہوں گی۔" یہ کہہ کر پھر انہوں نے اپنا گرز گراں اٹھایا۔

منصور نے کہا

"تو میں بتا دوں کس کا ہے یہ بچہ؟"

"جانتا ہے تو؟"

"اور نہیں تو کیا؟"

"کس حرامزادے کے ہیں یہ کرتوت؟"

"میرے، بچہ میرا ہے۔"

یہ سنتے ہی امی جان کے ہاتھ سے چھڑی چھوٹ کر گر پڑی۔ شاکر کے ہاتھ پاؤں میں رعشہ آگیا۔ رضیہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ صنوبر چپ چاپ پٹی تھی۔ اس کا چہرہ اس طرح چمکنے لگا۔ جیسے ابھی ابھی اس پر چار چوٹ کی مار نہیں پڑی تھی۔ پھولوں کی بارش ہوئی تھی۔ بچہ بدستور روئے چلا جا رہا تھا۔

منصور نے رضیہ سے کہا۔

"بھابی صنوبر کو میرے کمرہ میں پہنچا دو۔"

پھر وہ ثریا سے مخاطب ہوا۔

"تم ذرا لیڈی ڈاکٹر اوجھا کو فون کرو۔ فوراً آجائیں۔"

دونوں باتوں کی فوراً تعمیل ہوئی۔ صنوبر منصور کے کمرہ میں پہنچا دی گئی۔ اور ثریا کے فون کرتے ہی لیڈی ڈاکٹر آن موجود ہوئی۔ اس نے آتے ہی صنوبر کا معائنہ کیا۔ اسے طاقت کی دوا دی۔ اس کے اعصاب پر بہت برا اثر پڑا تھا۔

جاتے وقت وہ منصور کے پاس سے گزری۔ منصور نے پوچھا "کوئی اندیشہ کی بات تو نہیں ہے۔ زچہ اور بچہ کے لئے؟"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا "بالکل نہیں۔ میں نے طاقت کی دوا دے دی ہے۔ اعصابی کمزوری ہے ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن کم از کم پندرہ روز تک بہت زیادہ احتیاط اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ ذرا بھی بے کلی ہوئی یا صدمہ پہنچا۔ تو اس کی زندگی خطرہ میں

rekhta

مار رہی تھیں۔ امی جان کو اس پر غصہ نہیں تھا۔ کہ صنوبر کنوارے پنے میں ایک بچہ کی ماں کیسے بن گئی۔ جتنا نہیں اس راز کے ظاہر کرنے کا اشتیاق تھا کہ یہ سوغات ہے کس کی؟ وہ کون دیدہ دلیر ڈاکو تھا جس نے ان کے حصار میں آکر ڈاکہ ڈالا۔ اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ آج تک اس گھر میں کوئی واقعہ اس طرح کا نہیں ہوا تھا۔ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ صنوبر کی طرح اب دوسری باندیاں بھی ادھمانے لگیں گی۔ پھر کیا ہوگا اچھا خاصہ حرامی بچوں کا بورڈنگ بن جائے گا یہ گھر۔

منصور نے بڑی ملائمت کے ساتھ امی جان سے پوچھا۔

"کیوں مار رہی ہیں آپ اسے؟"

"دیکھ تو رہے ہو اپنی آنکھوں سے۔ بی بو خیر سے ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب بچہ کی ماں بن گئیں۔ اور یہاں کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ کیا کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔۔۔

۔۔۔ مالزادی حرافہ۔۔۔۔۔"

یہ کہہ کر پھر انہوں نے مارنے کے لئے چھڑی اٹھائی۔ منصور نے چھڑی اپنے ہاتھ پر روک لی۔ پوچھا۔

"کیا کہتی ہے یہ کس کا ہے یہ بچہ؟"

"یہی تو نہیں بتاتی سور کی بچی۔ میں اسے مار ڈالوں گی۔ لیکن پوچھ کر رہوں گی۔" یہ کہہ کر پھر انہوں نے اپنا گرز گراں اٹھایا۔

منصور نے کہا

"تو میں بتا دوں کس کا ہے یہ بچہ؟"

"جانتا ہے تو؟"

"اور نہیں تو کیا؟"

"کس حرامزادے کے ہیں یہ کرتوت؟"

"میرے۔ بچہ میرا ہے!"

یہ سنتے ہی امی جان کے ہاتھ سے چھڑی چھوٹ کر گر پڑی۔ سنا کے ہاتھ پاؤں میں رعشہ آگیا۔ رضیہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ صنوبر چپ چاپ پڑی تھی۔ اس کا چہرہ اس طرح چمکنے لگا۔ جیسے ابھی ابھی اس پر چار چوٹ کی مار نہیں پڑی تھی۔ پھولوں کی بارش ہوئی تھی۔ بچہ بدستور روئے چلا جا رہا تھا۔

منصور نے رضیہ سے کہا۔

"بھابی صنوبر کو میرے کمرہ میں پہنچا دو۔"

پھر وہ ثریا سے مخاطب ہوا۔

"تم ذرا لیڈی ڈاکٹر اوجھا کو فون کرو۔ فوراً آجائیں۔"

دونوں باتوں کی فوراً تعمیل ہوئی۔ صنوبر منصور کے کمرہ میں پہنچا دی گئی۔ اور ثریا کے فون کرتے ہی لیڈی ڈاکٹر آن موجود ہوئی۔ اس نے آتے ہی صنوبر کا معائنہ کیا۔ اسے طاقت کی دوا دی۔ اس کے اعصاب پر بہت برا اثر پڑا تھا۔

جاتے وقت وہ منصور کے پاس سے گذری۔ منصور نے پوچھا "کوئی اندیشہ کی بات تو نہیں ہے۔ زچہ اور بچہ کے لئے؟"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا "بالکل نہیں۔ میں نے طاقت کی دوا دے دی ہے۔ اعصابی کمزوری ہے ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن کم از کم پندرہ روز تک بہت زیادہ احتیاط اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ ذرا بھی بے کلی ہوئی یا صدمہ پہنچا۔ تو اس کی زندگی خطرہ میں

(ڈپٹ کر) "کیا کہا آپ نے؟"

"اس گھر میں تم جیسے بچے اور تمہارے نہیں رہ سکتے۔ نکل جاؤ یہاں سے؟"

"خالی کر دو یہ گھر"

"زیادہ دیر تک میرے تحمل اور بردباری کا امتحان نہ لیجئے۔ میں یہ الفاظ یہ باتیں نہیں سن سکتا۔"

"تو بدمعاش ہے۔ ننگ خاندان ہے۔"

"کیوں چھوڑ دوں یہ گھر؟ کس میں طاقت ہے کہ یہ گھر مجھ سے چھڑائے۔ گھر آپ کا نہیں میرے باپ کا ہے۔ اس گھر میں آپ رہ سکتے ہیں تو میں بھی رہ سکتا ہوں۔ اگر وہ لوگ یہاں رہ سکتے ہیں جو رنڈی باز ہیں۔ تو وہ لوگ بھی رہ سکتے ہیں جو لونڈی باز ہیں۔ آپ آئینے میں اپنا چہرہ نہیں دیکھتے۔ وہ سمردن کے تل اور مہاسے آپ کو خوب نظر آتے ہیں۔ آپ نہ جانے کب سے رنڈی بازی کر رہے ہیں۔ اس دوران میں نہ جانے کتنی لڑکیاں اور لڑکے آپ کی مہربانی سے رنڈیوں کے زینت آغوش ہوئے ہوں گے۔ اور اب وہ بھی وہی ٹریننگ حاصل کر رہے ہوں گے۔ لیکن میں نے اپنے گھر کی ایک لونڈی سے جسے میں نے پسند کیا۔ ربط بڑھایا۔ تعلق پیدا کیا۔ اس سے اولاد ہوئی۔ میں کانوں پر ہاتھ رکھ کے بھاگ گیا نہیں۔ وہ میری اولاد ہے۔ میں اسے پالوں گا اور اس کی ماں بیوی کی طرح میرے پاس رہے گی۔۔۔۔"

ابھی منصور کا سلسلہ کلام جاری تھا کہ امی جان بولیں۔

ہائے غضب یہ اندھیر دیکھو لوگو۔ چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے منہ آ رہا ہے۔ ماں کے سامنے اپنی بدمعاشی کو سراہ رہا ہے۔ میں کہے دیتی ہوں دفان ہو جا یہاں سے۔ نہیں تو مجھ

سے برا کوئی نہ ہوگا۔ ہاں! مجھے دیتی ہوں میں!"

"امی جان یہ نہیں ہو سکتا"

"تو کیا منصور یہ میری بہو بنے گی۔ موتی وہ کوڑی کی چھوکری!" یہ کہہ کر وہ رونے لگیں۔

منصور نے کہا۔

"بہو کا رشتہ آپ پسند کریں یا نہ کریں۔ قائم ہو چکا۔ وہ اب ٹوٹ نہیں سکتا۔ میں آپ کے ولی عہد صاحب کی طرح نہیں ہوں کہ آج اس سے جی بھر گیا تو چھوڑ دیا۔ کل اس پر دل آیا تو اسے سر پر چڑھا لیا۔"

"یہ لونڈی بچی حرام زادی اور میری بہو؟"

"تو اس میں کیا ہوا؟ آخر آپ لونڈی کو اتنا برا کیوں سمجھتی ہیں؟ کیا لونڈی انسان نہیں ہوتی؟ اس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل نہیں ہوتا؟ اس میں وفا نہیں ہوتی؟"

"ہوتی۔ نیچ لوگوں میں وفا ڈھونڈ رہے ہیں میاں صاحبزادے؟"

"امی جان تم ہی اس کی ماں کی وفاداریوں کا راگ الاپا کرتی تھیں۔ میرے تو ہوش سے بھی پہلے کی باتیں ہیں۔ پھر کیا ایک لونڈی اپنے آقا سے وفا کر سکتی ہے۔ اپنے چاہنے والے سے اپنے شوہر سے نہیں کر سکتی؟ کیا کہہ رہی ہو اماں جان تم؟"

یہ دیکھو اس نالائق کو یہ بھی نہیں معلوم۔ لونڈیاں ہرجائی ہوتی ہیں۔ ذلیل۔ کمینی نیچ!"

"معلوم تو ہے۔ لیکن میں مانتا نہیں۔"

"کیا نہیں مانتا تو"

"یہ کہ لونڈیاں ذلیل اور نیچ ہوتی ہیں۔ اور یہ بات امی جان تم بھی لاعلمی میں کہہ رہی

ہو ورنہ جانتی ہو۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔"

"ذرا میں بھی تو سنوں کہاں سے کہاں بات پہنچا دے گا تو موئے سینپرے۔"

"مسلمانوں کی تاریخ سے اگر لونڈیوں کا ذکر نکال لیا جائے۔ تو تمہارے بڑے بڑے شاہ و شہریار جن کے نام سن کر تمہارے بدن میں جھرجھری سی آ جاتی ہے۔ جن کی عظمت تمہارے دل پر نقش ہے۔ جن کے ذکر سے تمہارا میلوں خون بڑھ جاتا ہے۔ کہاں جائیں گے۔"

"کیا بک رہا ہے جاہل۔"

"امی جان! تم نہیں جانتی ہو۔ بھائی جان شاید جانتے ہوں تمہارے عرب شریف کے اموی اور عباسی خلفا میں بہت سے ایسے تھے۔ جو ام ولد تھے۔ ہندوستان پر تو خاندان غلاماں نے حکومت کی۔ یہ دہلی کا قطب مینار جسے دیکھنے دور دور سے لوگ آتے ہیں اور ادب سے سر جھکاتے ہیں۔ ایک غلام ہی کا بنایا ہوا ہے۔ تم تو نانی دادی کا اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ اسلام لونڈی کی اتنی ہی عزت کرتا ہے۔ جتنی ایک شریف عورت کی۔ لونڈی سے شادی کا شرعاً ثواب ہے۔ پھر تم اس کا خیر یہ بجائے اس کے مجھے مبارک باد دو۔ کیوں کیوں رہی ہو۔ خفا کیوں ہو رہی ہو؟"

امی جان اور شاکر دونوں چپ تھے۔ منصور کہہ رہا تھا۔

"پچھلے زمانہ کی باتوں کو چھوڑو۔ آج کل جو ہو رہا ہے اسے دیکھو۔"

"اے چل ہٹ جھلیا۔ حرام خور۔"

نہیں کہہ رہی تھیں۔ چچا جان کے ہاں جو لونڈی ہے۔ گلاب اس کی لڑکی چنبیلی کا نقشہ بالکل چچا جان سے ملتا جلتا ہے۔ (چچی جان بھی حاضرین مجلس میں موجود تھیں۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ امی جان کا ایک رنگ آنے اور ایک جانے لگا) پھر وہ تو ویسے ہی لالوں کے لال

کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ گلاب کو اور اس کے ساتھ چنبیلی کو ایک ٹنگ وڑی بنائے ہوئے ہیں۔ اور میں برا ہو گیا جو اپنے بیٹے کو بیٹا جا کر کہنا چاہتا ہوں۔ کیوں امی جان یہ ہے انصاف تمہارا؟"

"اول تو میں نے گلاب اور چنبیلی اور تیرے چچا کے بارے میں کچھ کہا نہیں تو جھوٹا ہے۔ لیکن مان لیا جائے کہ کہا۔ آ بھی تیرے چچا نے رہا بگاڑ کیا؟ ماشاءاللہ بیوی موجود ہے۔ بچے موجود ہیں۔ چنبیلی جہاں کی تھی وہیں رہی کیا یاد رہے گا۔ وہ کوئی شریف ہے؟ تو بھی کرتا؟"

اب چچی کا پارہ چڑھ چکا تھا۔ انہوں نے تیکھی نظروں اور تلخ لہجہ کے ساتھ کہا۔

"یہ بھی اچھی رہی۔ بات ہو رہی تھی اس بیٹے کی۔ جھگڑا تھا منصور اور منصور کا اور ذکر چھڑ گیا ان بیچارے کا۔ انہوں نے کیا کسی کا بگاڑا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ منصور کے سامنے سے اٹھیں۔ اماں جان سمجھ گئیں۔ اگر چچی نے اپنے گھر جا کر شکایت لگائی تو ایک مصیبت ہے۔ تو ابھی جھگڑا انہیں ہوا دوسرا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹھو دلہن تم بھی کس کے کہنے میں آ گئیں۔ یہ میرا لڑکا نہیں ہے۔ بس کا کانٹا ہے۔ دیکھو کیا حال کر رکھا ہے۔ اس نے میرے گھر کا۔ اب تم بھی روٹھ جاؤ گی۔ تو میں کس کا سہارا لوں گی۔"

یہ کہہ کر امی جان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ چچی جان ذرا کی ذرا رکیں۔ انہوں نے کہا۔

"بھئی یہ سب سچ ہے۔ مگر ہم سے ان کے بیان کھمان بھی نہیں سنے جاتے۔"

"دلہن کون ان کے بیان بکھان کر رہا ہے۔ اسے تو لڑنے میں مزا آتا ہے۔ یہ تو

گھر بیٹھ کر تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔ خدا دشمن کو بھی ایسی اولاد نہ دے۔"

"امی جان میری جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے۔ مجھے جھوٹا نہ بناؤ۔"

"ہاں اور کیا تو ہی تو ایک سچا رہ گیا ہے!"

"پھر میں کہوں گا کچھ۔"

"کیا کہے گا تو؟ گالیاں دے گا مجھے؟ دے لے۔ یہ حسرت بھی نکال ڈال۔"

"میں گالیاں کیوں دینے لگا؟"

"تو تو نے مجھے کسی کے سامنے کا چھوڑا تھا۔ حرام خور جو کچھ کیا تو۔ مجھے بھی قسم ہے۔"

جو منہ کہہ دے۔"

"ابھی پرسوں پرسوں کی بات ہے۔ تم نہیں کہہ رہی تھیں کہ......"

"ہاں بول کیا کہہ رہی تھیں میں؟"

"کہ خالہ جان کی تو اس تجویز پر......"

"اچھا اب چپ رہ مردود۔ نہیں تو تیرا گلا گھونٹ دوں گی کمبخت!"

"اچھی امی جان دلیشہ خفگی ہو رہی ہیں۔"

امی جان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ خالہ جان کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اور ممانی جان زرد پڑ گئیں۔ کیسے کیسے عقدے کھل رہے تھے آج! کن کن چہروں سے نقاب اٹھ رہا تھا۔

اس وقت یہ چچی جان، یہ خالہ اماں، یہ ممانی صرف تماشا دیکھنے آئی تھیں۔ یہ تو آئی تھیں کہ منصور کا مذاق اڑائیں، امی جان کا کلیجہ چھلنی کریں۔ گھڑی دو گھڑی لطف لیں اور پھر اپنے اپنے گھر جا کر جی کھول کر اس گھر میں آ کر ہوئی باتیں، نمک مرچ لگا کر اس داستان کو سب سے بیان کریں۔ لیکن ہوا یہ کہ یہ سب خود تماشا بن گئیں۔ منصور نے سب کے سامنے آئینہ لا کر رکھ

دیا۔

"ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے"

منصور کی باتیں سن کر سب جوالا مکھی کی آگ کی دیوی بن گئی تھیں۔ لیکن منصور کے انکشافات نے اس جوالا مکھی پہ ہمالیہ جیسے جوالا مکھی کو عرق انفعال میں غرق کر دیا۔

ایک سناٹا سا سارے جلسے پر چھایا ہوا تھا۔

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

لیکن منصور کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"ابھی اس طرح کی اور بھی کتنی باتیں ہیں۔ میرے دماغ کے پنجرہ میں پر تول رہی ہیں۔ میرا بھی جی چاہ رہا ہے۔ کھول دوں قفس کی کھڑکی۔ نکل جانے دوں انہیں کب تک قید رہیں گی بے چاری میرے پاس۔"

امی جان پر پھر وحشت طاری ہوئی۔ انہوں نے کہا۔

"منصور تو ایک چھری لے آ اور بھونک دے، اسے میرے سینہ میں!"

"کیوں؟ یہ کیوں؟"

"تیری باتیں مجھ سے نہیں سنی جاتیں"

لیکن میں جو سن رہا ہوں تم سب کی باتیں۔ میں چاہتا ہوں جو مجھے برا سمجھ رہا ہے۔ وہ زیادہ دیر کے لئے نہیں صرف تھوڑی دیر کے لئے گریبان میں منہ ڈال لے اور میری آنکھوں کا تنکا دیکھنے سے پہلے دل کے آئینے میں اپنی آنکھوں کا شہتیر بھی دیکھ

ہے۔

"بہت دیکھ لیا۔ معاف کرو۔ چلے جاؤ یہاں سے!"

بغیر کسی تحریک کے اب مجمع خود تتر بتر ہونے لگا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب چھٹ گئے۔ البتہ شاکر اب بھی بت بنا کھڑا تھا۔ اور دادی جان اب بھی ایک مجسمہ حیرت کی صورت میں اپنی جگہ نصب تھیں۔

صنوبر بے ہوش پڑی تھی۔ رضیہ اور ثریا جاگ رہی تھیں۔ دونوں اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ بچہ رضیہ کی گود میں تھا۔

منصور ان دونوں کی طرف مخاطب ہوا۔

"اب تم جاؤ۔ بڑی تکلیف کی تم نے۔ میں بیٹھا ہوں۔ سویرے سے نرس آ ہی جائے گی۔"

ثریا نے کہا۔

"آپ یہاں بیٹھ کر کیا کریں گے۔ عورت عورت کا دکھ سمجھتی ہے کر لیں گے ہم دونوں دیکھ بھال۔ جائیے آپ سو رہیے!"

رضیہ بولی۔

"چلو ثریا ہم تم چلیں منصور کو اور اس بچے کو یہیں چھوڑ دو۔ یہ بڑی اچھی طرح اسے دودھ پلائیں گے!"

منصور پر اس وقت سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ ثریا بھی بہت خاموش سی تھی۔ لیکن رضیہ کی ایک بات نے دونوں کے لبوں پر تبسم کی بہار پیدا کر دی۔

منصور دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ رضیہ اور ثریا صنوبر کے پاس رہیں۔ تین بج چکے تھے رات کے۔ منصور لیٹتے ہی خراٹے لینے لگا۔

شاکر اور دادی جان دونوں ایک دوسرے سے بات کئے بغیر جدا ہوگئے۔ اپنی چارپائی پر وہ کروٹیں بدل رہی تھیں۔ نیند کا کہیں کاہے کو سوں پتہ نہیں تھا اور شاکر دیوار پر نظر گاڑے ہوئے تھا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ میں سمجھ رہا تھا منصور راہ راست پر آگیا۔ لیکن وہ تو ایک ہی جست میں نہ معلوم کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ کیا ہو گیا ہے اسے۔ اور ثریا کو یہ دونوں ایسی حرکتیں کر گزرتے ہیں۔ جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اب تو ثریا کو اور شہ مل گئی۔ اب تو اس کا پلہ اور بھاری ہو گیا۔ اب کوئی زبردستی اس پر نہیں کی جا سکتی۔ اور کی بھی جائے تو وہ کارگر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اور زیادہ خطرہ کا بدنامی کا ذلت کا موجب بن جائے گی پھر؟

وہ بھی سو گیا۔

باب ۲۸

الجھن

سونے کو تو شاکر سو گیا۔ لیکن عجیب عجیب خواب دیکھنے لگا۔ کبھی دیکھتا بڑے زور کا سیلاب آ رہا ہے اور وہ تنکے کی طرح بہا چلا جا رہا ہے۔

"نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

کبھی اسے نظر آتا۔ کہ ثریا بھی طوائف بن گئی ہے۔ ایک کوٹھے پر وہ ناچ رہی ہے۔ گا رہی ہے اور بڑے بڑے سیٹھ اور ساہوکار زمیندار سرمایہ دار نقد جان تک نثار کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ کبھی اس کے سامنے زہرہ آ جاتی۔ کہتی۔ کیوں جناب آ گئی نا ثریا میرے بھائی کی بیوی بن کر۔ بڑا ناز تھا آپ کو اپنے خاندان پر۔ بے وقوف کہیں کے۔ مجھے بھی کھویا اور ثریا کو بھی پہلے ہی اگر میرا کہا مان لیتے۔ تو کیوں یہ دن دیکھنا پڑتا۔ یہ سین بھی بدل گیا۔ اور منصور خوفناک آنکھوں کے ساتھ ہاتھ میں کھلا خنجر لئے بڑھتا نظر آیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دے گا۔

یہ منظر دیکھ کر اس کے حواس پراں ہو گئے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ مشکل سے ایک گھنٹہ سو پایا ہو گا۔ کہ آنکھ کھلی تو نہ منصور تھا نہ ثریا۔ نہ زہرہ نہ سیلاب۔ اس نے پھر سونے کی کوشش کی۔ مگر وہ سونے کی چڑیا اڑ چکی تھی۔ کچھ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ جب دیکھا نیند آ ہی نہیں رہی ہے تو اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ منہ دھویا اور چلا سیدھا یاسین کے گھر۔

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند
بلاکشانِ محبت بہ کوئے یار روند

یہاں اب رات ہوتی تھی۔ بالاخانوں کی زندگی ایسی ہی ہوتی تھی۔ وہاں رات دن کی طرح منائی جاتی ہے۔ اور دن کو رات سمجھ کر نیند کے دامن میں پناہ لی جاتی ہے۔ گھر بھر سو رہا تھا۔ شاکر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بڑی دیر کے بعد ستارہ نے آ کر دروازہ کھولا۔ اور شاکر کے اندر آتے ہی پھر بند کر لیا۔

اس سے شاکر نے پوچھا۔

"باقی کہاں ہیں؟"

"سو رہی ہیں اپنے کمرہ میں"

"اور کوئی ہے وہاں"

(مسکرا کر شرماتے ہوئے) "اوئے وہ ہم سے چھیڑ نہ کیا کرو۔ نہیں تو کہہ دوں گی باقی سے۔ بڑے آئے کہیں کے"

شاکر نے اسے ڈانٹا۔

"ارے الو کی پٹھی جو میں پوچھتا ہوں۔ بتا۔ باقی اکیلی ہیں نا؟"

یہ منظر دیکھ کر اس کے حواس پرمن ہو گئے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ مشکل سے ایک گھنٹہ سو پایا ہوگا۔ کہ آنکھ کھلی تو نہ منصور تھا نہ ثریا۔ نہ زہرہ نہ سیلاب۔ اس نے پھر سونے کی کوشش کی۔ مگر وہ سونے کی گھڑی بیت چکی تھی۔ کچھ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ جب دیکھا نیند آ ہی نہیں رہی ہے تو اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ منہ دھویا اور چلا سیدھا یاسمین کے گھر۔

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند
بلا کشان محبت بہ کوئے یار روند

یہاں اب رات ہوتی تھی۔ بالاخانوں کی زندگی ایسی ہی ہوتی تھی۔ وہاں رات دن کی طرح منائی جاتی ہے۔ اور دن کو رات سمجھ کر نیند کے دامن میں پناہ لی جاتی ہے۔ گھر بھر سو رہا تھا۔ شاکر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بڑی دیر کے بعد ستارہ نے آکر دروازہ کھولا۔ اور شاکر کے اندر آتے ہی پھر بند کر لیا۔

اس سے شاکر نے پوچھا۔

"باجی کہاں ہیں؟"

"سو رہی ہیں اپنے کمرہ میں"

"اور کوئی ہے وہاں"

(مسکرا کر شرماتے ہوئے) "اوئے وہ ہم سے چھیڑ نہ کیا کرو۔ نہیں تو کہہ دوں گی باجی سے۔ بڑے آئے کہیں کے"

شاکر نے اسے ڈانٹا۔

"ارے لڑکی تجھی جو میں پوچھتا ہوں۔ بتا۔ باجی اکیلی ہیں نا؟"

"ہاں ہاں۔ ابھی تو سو رہی ہیں۔ ابھی ابھی تو لالہ جی گئے ہیں یہاں سے۔"

یہ سن کر شاکر کو کچھ غصہ سا آیا۔ اس نے یاسمین کے جملہ مصارف اپنے ذمے لے رکھے تھے اور شرائط معاہدہ یہ تھے کہ وہ کسی اور سے راہ و رسم نہیں رکھے گی۔ لالہ شنکر لال کے بارے میں اسے اپنے جاسوسوں سے برابر سن گن مل رہی تھی کہ چوری چھپے وہ آتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ سنی کو ان سنی کر دیتا تھا۔ آج تو ستارہ کہہ رہی تھی وہ کیوں جھوٹ بولنے لگی۔

اس کا جی تو چاہا ابھی جا کر یاسمین کو اس ذلیل حرکت پر جھاڑے۔ لیکن مصلحت اسی میں دیکھی کہ اس وقت اس معاملہ کو دبا دیا جائے۔ اس کا فیصلہ پھر کسی وقت ہو رہے گا۔ اس وقت تو اسے یاسمین سے نئی صورت حال بیان کر کے اس کا قیمتی مشورہ لینا تھا۔ دیکھنا تھا وہ کیا تجویز کرتی ہے اب؟

وہ سیدھا یاسمین کے کمرہ کی طرف گیا۔ اندر سے کنڈی لگی تھی۔ اس نے کھٹکھٹایا۔

"اوہ! تو یہ آلا کون ہے؟"

بڑبڑاتی ہوئی یاسمین باہر آئی۔ اس نے شاکر کا اترا ہوا چہرہ لال آنکھیں جو دیکھیں تو دبک سے ہو گئی۔

"یہ کیا ہو گیا تمہیں؟"

"یہی سنانے تو آیا ہوں"

"تو آؤ بیٹھو"

یاسمین اسے اپنے کمرہ میں لے گئی اور ستارہ کو آواز دی۔ وہ فوراً حاضر ہوئی۔ حکم دیا چائے بنا لا جلدی سے۔ وہ تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوئی اور یاسمین نے پھر شاکر سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، ابھی تو سوتی ہیں۔ ابھی ابھی تو لالہ جی گئے ہیں یہاں سے۔"

یہ سن کر شاکر کو کچھ غصہ سا آیا۔ اس نے یاسمین کے جملہ مصارف اپنے ذمہ لے رکھے تھے اور شرائط معاہدہ یہ تھے کہ وہ کسی اور سے راہ و رسم نہیں رکھے گی۔ لالہ شنکر لال کے بارے میں اسے اپنے جاسوسوں سے برابر سن گن مل رہی تھی کہ چوری چھپے وہ آتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ سنی کی ان سنی کر دیتا تھا۔ آج تو ستارہ کہہ رہی تھی وہ کیوں جھوٹ بولنے لگی۔

اس کا جی تو چاہا ابھی جا کر یاسمین کو اس ذلیل حرکت پر جھاڑے۔ لیکن مصلحت اسی میں دیکھی کہ اس وقت اس معاملہ کو دبا دیا جائے۔ اس کا فیصلہ پھر کسی وقت ہو رہیگا۔ اس وقت تو اسے یاسمین سے نئی صورت حال بیان کر کے اس کا قیمتی مشورہ لینا تھا۔ دیکھنا تھا وہ کیا تجویز کرتی ہے اب؟

وہ سیدھا یاسمین کے کمرہ کی طرف گیا۔ اندر سے کنڈی لگی تھی۔ اس نے تھپتھپایا۔

"اونہہ، توبہ! اللہ کون ہے؟"

بڑبڑاتی ہوئی یاسمین باہر آئی۔ اس نے شاکر کا اترا ہوا چہرہ لال لال آنکھیں جو دیکھیں تو دھک سے ہو گئی۔

"یہ کیا ہوا تمہیں؟"

"یہی سنانے تو آیا ہوں"

"تو آؤ بیٹھو"

یاسمین اسے اپنے کمرہ میں لے گئی اور ستارہ کو آواز دی۔ وہ فوراً حاضر ہوئی۔ حکم دیا چائے بنا لا جلدی سے۔ وہ تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوئی اور یاسمین نے پھر شاکر سے پوچھا۔

"کچھ کہو تو کیا ماجرا ہے؟"

"ایک مصیبت ختم نہیں ہوئی تھی۔ کہ دوسری مصیبت اس سے بھی بڑی سامنے آن کھڑی ہوئی۔"

"یہی تو پوچھ رہی ہوں میں۔ کہو نا میاں (یہاں) دل ہولا جا رہا ہے۔ تمہارے سر کی قسم!"

شاکر نے ساری رام کہانی سنا ڈالی۔ یاسمین بڑی توجہ سے سن رہی تھی۔ اس نے نہ اب تک کلی کی تھی۔ نہ پان کھایا تھا۔ چائے بھی جو رکھی رکھی ٹھنڈی ہو گئی۔ مگر وہ استغراق سے شاکر کی باتیں سن رہی تھی۔ چائے کا ہوش بھی نہیں تھا اسے۔

یاسمین نے پھر ستارہ کو آواز دی۔

"دیکھ یہ چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ پھر سے گرم کر لا۔ اور ہاں ذرا پہلے گلاس میں پانی دے جا میں کلی کر لوں۔ وہ اگالدان رکھا ہے۔ اٹھا تو لا۔ اور ایک گلوری بھی بنا کے مجھے دے دے۔"

ستارہ گلاس میں پانی اور اگالدان لائی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے یاسمین نے کلی کی۔ اتنے میں ستارہ گلوری بھی لے آئی۔ اسے لے کر یاسمین نے منہ میں رکھا۔ دانتوں کے نیچے آنے کے بعد وہ گلوری اس طرح چرچرائی جیسے کسی کرّے چارپائی پر کوئی بھاری بھرکم آدمی کروٹ پر کروٹیں لینے لگے۔

منہ کی کلی میں ابھی پان اچھی طرح لب نہیں تھا۔ کہ ستارہ چائے گرم کر کے لے آئی۔ پان یاسمین نے اگالدان میں تھوکا۔ اور دو پیالیاں اپنے ساتھ رکھ کے چائے بنانے لگی۔

شاکر نے کہا۔

"تمہیں چائے کی سوجھی ہے یہاں جان پر بنی جا رہی ہے"

"یہی تو میں سوچ رہی ہوں"

"کیا سوچا تم نے؟"

"کیا بتاؤں میری تو خود ہی گم ہو رہی ہے غضب خدا کا"

"تو مان لوں ہار؟ ڈال دوں ہتھیار؟"

"یہ میں کیسے کہوں؟"

"کچھ کہو بھی تو"

دونوں پیالیاں بن چکیں۔ ایک اس نے اپنی طرف سرکالی۔ دوسری شاکر کی طرف بڑھا دی۔ پیالی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"چائے پیو۔ کیا سوچتے ہو!"

شاکر نے چائے کی پیالی اٹھالی۔ اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ یاسمین کے ہاتھ میں پیالی تھی۔ ایک ایک گھونٹ کر کے وہ پی رہی تھی۔ اور بھویں اوپر کو اٹھائے ہوئے کسی گہرے سوچ میں پڑی ہوئی تھی۔ بالکل خاموش!

شاکر کی پیالی ختم ہو گئی۔ لیکن یاسمین کی پیالی آدھی سے زیادہ باقی تھی۔ وہ بدستور سوچے جا رہی تھی۔ اتنے میں ستارہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ یاسمین نے جلدی جلدی چائے پی اور ٹرے کی طرف دیکھ کر گردن ہلا دی۔ ستارہ نے برتن بڑھائے اور چلی یاسمین اب بھی گپ چپ بیٹھی تھی۔

بڑی دیر کے بعد یاسمین نے پوچھا۔

"تو تم اب کچھ نہیں کر سکتے؟"

"تمہیں بتاؤ۔ اس حالت میں کیا کر سکتا ہوں"

"ہاں ٹھیک ہے چپ سادھ لو تم"

"ثریا کو جانے دوں شاہد کے گھر؟"

"یہ نہیں ہونا چاہیے"

"کیونکر؟ یہی تو پوچھتا ہوں میں؟"

"انور اپنا کام کرے گا۔ اس کے گھر میں نہ کوئی ثریا ہے نہ منصور اور شاکر بھی نہیں۔"

"کیا کرے گا وہ؟"

"یہ ابھی نہیں بتاؤں گی۔ اس وقت صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ تم فکر نہ کرو۔ جو کام تم سے نہ ہوا وہ میں کروں گی۔ جو مشکل تم سے حل نہ ہوئی اسے انور حل کرے گا۔"

"اچھا بھئی دیکھیں گے تم کو اور تمہارے انور کو۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ انور آ گیا۔ اسے دیکھ کر یاسمین مسکرائی کہنے لگی۔

"یاد ہے انور وہ کل کی بات؟"

"ہاں خوب یاد ہے"

"تو پھر کب؟"

"آج ہی اور کب؟"

"شاباش بھیا! خوب جی لگا کے کام کرنا۔ دیکھ کتنا بڑا انعام رکھا ہے۔ تیرے لیے شاکر صاحب نے!"

"ہاں دیکھو میں تو جان پر کھیل رہا ہوں میں!"

rekhta

یہ کہہ کر انور تو مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا چلا گیا۔ اور یاسمین بڑے فخر کی نگاہوں سے دیکھنے لگی اسے۔

"کیا قتل کرا دو گی شاہد کو؟"

"اجی محبت بھتنی پر"

"لاحول ولا قوۃ"

"سچ کہنا"

"کچھ پاگل ہو گئی ہو۔ میں تو ایک بات پوچھ رہا تھا۔"

"نہیں قتل تو نہیں کراؤں گی۔ لیکن مزا ضرور چکھاؤں گی۔"

"آخر کیا پروگرام ہے تمہارا؟"

"یہ راز کی باتیں ہیں بتایا نہیں کرتے۔"

"راز مجھ سے بھی"

"ہاں مصلحت اسی میں ہے۔"

"شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔"

"تمہاری بہترین مدد یہ ہے کہ دخل نہ دو۔ جو ہو رہا ہے ہونے دو۔"

"بہت خوب سرکار"

یہ کہتے کہتے کسی حد تک شاکر کے ہونٹ تبسم سے آشنا ہوئے۔ لیکن فوراً ہی پھر اس پر سنجیدگی غالب آگئی اور وہ خاموش ہو گیا۔

یاسمین نے پھر پاندان کھولا اور پان بنانے لگی۔

باب ۲۹

گھات

انور نے ثریا کو دیکھا نہیں تھا۔ لیکن یاسمین نے اس کے حسن جانسوز کی ایسی تعریف کی تھی کہ وہ اس کے عشق میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ وہ ثریا کا نادیدہ عاشق تھا اور اس کے عشق میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ وہ شاہد کو جانتا بھی نہیں تھا۔ کبھی اس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسے کوئی دشمنی بھی شاہد سے نہیں تھی۔ لیکن ؎

رند سے ذوق کو اس لئے تو ہے کی تلاش
کہیں مل جائے تو کم بخت کے ٹکڑے کر دے

وہ شاہد کی ٹوہ میں تھا۔ گھات لگائے ہوئے تھا کہ کہیں مڈبھیڑ ہو جائے۔ اور اسے مزا چکھا دے۔ ثریا کے ساتھ شادی کرنے کا۔ وہی ثریا جسے اب تک اس کی چشم شوق نہیں دیکھ سکی تھی۔ لیکن جو اس کے دل پہ ایک مطلق العنان فرمانروا کی طرح حکومت کر رہی تھی۔ جس کی تصویر اس کے تصور نے خود ہی بنائی تھی اور جسے دل نے پھر سے شروع کر

تھے۔ جسے حاصل کرنے کے لئے وہ ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کا ولولہ اپنے دل میں موجزن پاتا تھا۔

کالج کی تعلیم جب سے شاہد نے شروع کی تھی۔ اس نے زہرہ کے ہاں کا قیام خود اسی کے اصرار اور مرضی سے ترک کر دیا تھا۔ اس نے ایک الگ فلیٹ کرایہ پر لے لیا تھا اور وہیں مقیم تھا۔

اس نقل مکان کی وجہ یہ تھی کہ زہرہ کے گھر کا ماحول اس کے تعلیمی استغراق میں حارج تھا۔ اسے زہرہ سے بڑی محبت تھی۔ اتنی ہی جتنی ایک بھائی کو بہن سے ہونی چاہیئے۔ لیکن وہاں اسے یکسوئی نہیں حاصل تھی۔ اور وہ اسی کا جویا تھا۔ زہرہ کا اصرار اس کو بھٹکنے کو کھیلنے کا بہانہ ثابت ہوا۔ اور وہاں سے وہ ایک الگ فلیٹ میں اٹھ آیا۔ ایک بوڑھا نوکر ساتھ تھا۔ جو گھر کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا اور اس کو کھانا بھی پکا دیتا تھا۔

بعض دوستوں نے اصرار کیا بورڈنگ میں رہو۔ لیکن اس اصرار سے وہ متاثر نہیں ہوا۔ وہ کہتا تھا: ہاں تعلیم کم ہوتی ہے۔ کھیل زیادہ ہوتا ہے۔ وہ تھا کتابوں کا کیڑا۔ وہ ایسا ماحول چاہتا تھا۔ جہاں اس کے سکون کو کوئی درہم برہم نہ کر سکے۔ ناچار اس نے ایک چھوٹا سا فلیٹ کرایہ پر لے لیا۔ اس فیصلہ میں زہرہ بھی برابر کی شریک تھی۔

وہ ایک الگ محلہ میں بالکل الگ تھلگ زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ سویرے تڑکے دو تین میل کا گشت کرتا۔ پھر اپنے گھر آ کر ناشتہ کرتا۔ کچھ دیر مطالعہ میں وقت گزارتا۔ پھر زہرہ کے ہاں ہوتا ہوا کالج چلا جاتا۔

شاہد گشت کر کے واپس آ رہا تھا کہ اسے ایک بڑھیا ملی۔ وہ روتی ہوئی بہت بدحواس سی ہوئی۔

"کیا ہوا تمہیں؟" شاہد نے پوچھا۔

"میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کی بیوی دم توڑ رہی ہے۔ اسے تار دینا ہے۔"

"تو پیسے چاہئیں تمہیں؟"

"نہیں بیٹا"

"پھر کیا چاہتی ہو؟"

"انگریزی میں ایک تار لکھ دو۔ بس اتنا کام کر دو میرا۔"

"ہاں ہاں میں تیار ہوں۔ کہاں ہے گھر تمہارا؟"

"یہ رہا سامنے۔"

آگے آگے بڑھیا اور پیچھے پیچھے شاہد دونوں ایک گھر میں داخل ہوئے۔ صحن میں ہوتی ہوئی بڑھیا ایک کمرہ میں داخل ہوئی۔ دروازہ پر پہنچ کر اس نے کہا۔

"آجاؤ بیٹا اندر۔"

وہاں ایک خوبصورت عورت چارپائی پر لیٹی تھی۔ چہرہ پر کوئی خاص اثر بیماری کا نہیں تھا۔ کرسی پر شاہد کو بٹھا کر بڑھیا نے کہا۔ بیٹا! میں قلم دوات لے آؤں۔ ابھی آئی۔ شاہد جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ وہ باہر نکل گئی۔

اتنی دیر بھی وہاں تنہا بیٹھنا شاہد کو مناسب نہیں معلوم ہوا۔ وہ اٹھا کہ صحن میں اس کا انتظار کرے۔ وہ دروازہ تک پہنچا تھا۔ کہ ایک ہٹا کٹا نوجوان مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا ہاتھ میں ایک بڑا سا ڈنڈا لئے ہوئے ملا۔

"کون ہو تم؟"

"بڑی بی لائی ہیں مجھے؟"

"کیوں؟"

"تار لکھواؤں گی اپنے بیٹے کو"

"ابے بکتا کیا ہے ؟ کون بڑی بی۔ کیسا تار بدمعاش کہیں کا۔ مجھے دھوکا دیتا ہے۔ مارتے مارتے حلیہ بگاڑ دوں گا سالے کا!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ابے آپ کے بچے تو یہاں آیا کیوں ؟ دیکھ تو ابھی تیرا اور تیری آشنا (پلنگ پر لیٹی ہوئی عورت کی طرف اشارہ کرکے) کا کیا حال بناتا ہوں۔ ہمارے پیچھے یوں گلچھرے اڑائے جاتے ہیں؟"

یہ کہہ کر وہ اس عورت کی طرف پلٹا۔

"بتا کون ہے یہ تیرا دھگڑا؟"

وہ عورت رونے لگی۔ کہنے لگی۔

"پاؤں پڑتی ہوں۔ معاف کردو۔ بھول ہوئی!"

(ٹھوکر مار کر) "میں پوچھتی ہوں یہ ہے کون؟"

"آتے رہتے ہیں میرے پاس۔"

"منہ کالا کرنے؟"

عورت چپ رہی۔ وہ تیز مرد پھر شاہد کی طرف مخاطب ہوا۔

"کیوں جوان آج تو تم پھنسے!"

"یہ سب جھوٹ ہے۔ میں اس عورت کو جانتا بھی نہیں!"

"تو گھر تیرے باپ کا ہے؟ یہاں آیا کیوں؟"

"کہہ تو رہا ہوں تار لکھنے کے لئے آیا تھا۔ بڑی بی کے ساتھ۔"

"اچھا بیٹا بلاتا ہوں پولیس کو۔ ابھی وہ کاٹ دے گی تمہارا تار!"

وہ عورت اس کے پاؤں پر گر پڑی۔ رونے لگی۔

"ایسا نہ کرو۔ پولیس آئے گی۔ تو میں بھی تو پکڑی جاؤں گی۔"

"تو چھوڑ دوں اسے؟"

"یہ میں کب کہتی ہوں؟"

"پھر کیا بکتی ہے؟"

"دو چار جوتے مار کر نکال دو۔ انہیں گھر سے سزا مل جائے گی۔"

شاہد حیرت سے ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کیا کہے۔ کیا کرے؟ کس طرح گلو خلاصی حاصل کرے؟

وہ آدمی شاہد کے قریب آیا۔

"بیٹھ جاؤ اس کرسی پر۔"

شاہد بیٹھ گیا۔ اس نے پھر کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"شاہد"

"وہی شاہد؟"

"کون وہی؟"

"جس سے شاکر کی بہن نے شادی کی ہے؟"

"ہاں وہی تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں کیا سارا شہر جانتا ہے۔"

شاہد خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے پھر پوچھا۔

"یار اتنی اچھی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی تم میری عورت پر ہاتھ صاف کرتے رہے ہو؟"

"یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔"

"کون مانے گا تمہاری بات کو سچ۔ اس وقت ثریا آجائے تو وہ بھی تم پر دھتکار بھیجے گی۔"

"ثریا مجھے خوب پہچانتی ہے۔"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ سودا کرتے ہو۔ بولو؟"

"کیسا سودا؟"

"ہم تم بیوی بدل بھائی بن جائیں۔"

(غصہ کے ساتھ) کیا مطلب؟

"دیکھو جوان۔ نہ یہ نہ دکھاؤ۔ غصہ کرنا ہمیں بھی آتا ہے۔ ہاں بتاؤ منظور ہے میری بات؟"

"ہرگز نہیں۔"

"سوچ لو اچھی طرح"

"سوچ چکا۔"

"تو یہاں سے تم زندہ بچ کر نہیں جانے پاؤ گے بیٹا! ہڈیوں تک کا پتہ نہیں چلے گا۔ کچھ ہنسی کھیل سمجھے ہو۔ پرائی بہو بیٹیوں پر ہاتھ ڈالنا۔"

"یہ جھوٹا الزام ہے مجھ پر۔"

"اچھا تو اب فیصلہ ہو جائے ہمارا تمہارا۔"

یہ کہہ کر اس نے اس عورت سے کہا۔ جا میرا وہ چھرا لے آ۔

عورت چارپائی سے اٹھی اور الماری میں سے ایک بہت بڑا اور چمکدار چھرا لے آئی۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔

"ہائے کیا مار ڈالو گے انہیں؟"

"ہاں"

"چھوڑ دو میری توبہ۔ اب کبھی نہیں کروں گی ایسا۔ یہ بھی ہاتھ جوڑتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔ میں ہاتھ نہیں جوڑتا۔ میں اس عورت کو جانتا بھی نہیں۔"

"ابھی سب کچھ جان لوگے تم۔"

یہ کہہ کر وہ چھری چمکاتا ہوا شاہد کی طرف بڑھا۔ عورت نے پھر اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ اس نے ٹھوکر ماری۔

"بڑا اچھا ہے دھگڑے کا۔ اور وہ تھوکتا بھی نہیں تجھ پر۔ ایسی ہی اس کی محبت ہے تو راضی کرے اسے۔ وہ ثریا کو فارغ خطی لکھ دے۔ اور تم دونوں مزے اڑاؤ۔"

"ہائے اللہ مجھے چھوڑ دو گے تم؟"

"جوٹھے برتن میں کھانا میں نہیں کھاتا۔"

"تو میں کہاں جاؤں گی؟"

"اپنے اسی آشنا کے ساتھ۔"

وہ عورت شاہد کے پاس آئی۔ اس نے دست بستہ کہا۔

"رحم کرو۔"

"کیا کروں میں؟"

"میں تمہاری زندگی بھر سیوا کرونگی۔ تم نے میری جوانی لوٹی ہے۔ میرے ساتھ عشق کیا ہے۔ میرے شوہر کو مجھ سے چھڑا دیا ہے۔ میری طرف دیکھو۔ میں بھی بدصورت نہیں ہوں۔ میں وہی تو ہوں جسے تم پیار کیا کرتے تھے۔ جس کے گلے میں تم باہیں ڈالا کرتے تھے جس کے فراق میں تم رویا کرتے تھے۔ جس سے قسم کھا کھا کر اقرار محبت کیا تھا۔ مجھے ٹھکراؤ نئی دنیا نہ بساؤ۔ چھوڑو ثریا کا خیال نہ جانے کون ہے۔ یہ میری سوت! مجھ سے تو تم کہتے تھے۔ کہ بھاگ چل میرے ساتھ۔ تجھ سے شادی کرونگا۔ تیرے سوا کسی اور سے میں بیاہ نہیں رچا سکتا۔ پھر اب میں کیا سن رہی ہوں؟ کون ہے وہ ثریا جس نے تمہارے دل سے مجھے اتار دیا۔ اور خود چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے اوپر۔"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شاہد حیران و پریشان اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ معاملہ کیا ہے"؟ یہ عورت کون ہے؟ یہ مرد کون ہے۔

وہ اس عورت کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے زور سے اسے جھڑکا۔

"چپ رہو۔ میں تمہیں بالکل نہیں جانتا۔ میں تمہیں اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ میں ثریا کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر جانے کے ارادہ سے چلا۔ اس آدمی نے بڑھ کر شاہد کا گریبان پکڑا اور کہا۔

"اتنے سستے نہیں چھوٹ پاؤ گے جوان!"

شاہد نے ایک جھٹکا دے کر اس سے اپنا گریبان چھڑا لیا۔ اب تو اس کی

آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے کہا۔ اخاہ چوری اور سینہ زوری۔ چلے ہو بیٹا اپنا بل دکھانے۔ ذرا ان کلائیوں کا کس بل بھی تو دیکھ لو۔

یہ کہہ کر وہ چھرا لے کر شاہد کی طرف لپکا۔ شاہد بالکل نہتا تھا۔ لیکن اس نے بڑی جی داری سے اس کے وار کو روک لیا۔ وہ پہلوان بڑھ بڑھ کر شاہد پر وار کرتا تھا۔ لیکن شاہد کے دبلے پتلے بدن میں نہ معلوم اس وقت کہاں سے طاقت آگئی تھی۔ کہ وہ نہ صرف ان کے حملوں کو روک رہا تھا بلکہ موقع بہ موقع اس کے دو ایک گھونسے بھی لگا رہا تھا۔

بڑی دیر تک ان دونوں میں گتھم گتھا ہوتی رہی۔ نہ وہ غالب آتا تھا۔ نہ یہ آخر شاہد نے اس کا چھرا چھین لیا۔ اور اسے گرا کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ وہ آبدار چھرا اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور پہلوان کا سینہ صرف چند انچ کے فاصلہ پر۔

یہ رنگ دیکھ کر وہ عورت چیخنے لگی۔ دوڑو مدد کو۔

شاہد نے کہا۔ اب اگر تمہارے منہ سے ایک آواز بھی نکلی۔ تو یہ چھرا اس آدمی کے سینے کے پار ہوگا۔ پھر جو کچھ ہوگا ہوتا رہے گا۔

اب وہ عورت بھی گھگھیا رہی تھی۔ اور پہلوان صاحب بھی چھرا شاہد کے ہاتھ میں تھا۔ شاہد نے کہا۔ میں تمہاری جان نہیں لوں گا۔ لیکن ایک شرط ہے۔ مجھے یہ بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے۔ تم کون ہو؟ یہ عورت کون ہے۔ وہ بڑھیا کون تھی؟

پہلوان کا دم پھول رہا تھا۔ اس نے کہا۔ مجھے چھوڑ دو۔ ابھی بتاتا ہوں سارا ماجرا۔

شاہد نے اس عورت سے چھرا تانتے تانتے کہا۔ اس چارپائی کی ادوائن کھولو۔ اور ان

پہلوان صاحب کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔ تب اترونگا۔ میں اس کے سینے سے۔ لیکن یاد رکھنا ذرا بھی تم نے شرارت کی۔ اور یہ گئے۔ اس دنیا سے دوسری دنیا میں۔

عورت نے ادوائن کھولی۔ پہلے اس نے پہلوان کے دونوں پاؤں اچھی طرح باندھے پھر اس کے دونوں ہاتھ خوب مضبوطی سے جکڑ دیے ہیں۔ پھر بولی۔ اب تو چھوڑ دو انہیں۔

شاہد اس کے سینے سے اتر گیا۔ پہلوان زمین پر ایک موٹی گٹھڑی کی طرح بندھا پڑا تھا۔ شاہد کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ عورت اسی چارپائی کے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ شاہد نے پہلوان سے کہا۔ ہاں سناؤ سارا ماجرا۔ ذرا بھی جھوٹ بولے تو یہ چھرا تمہارا اور اس عورت کا خون پیے بغیر نہیں رہے گا۔

انور نے سارا واقعہ شاہد کو سنا دیا۔ اب سب کچھ شاہد کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے پوچھا۔ وہ بڑھیا کون تھی؟

انور نے کہا۔ تھی ایک کرایہ کی عورت۔

اور یہ عورت؟ شاہد نے پوچھا۔

"یہ بھی ایک طوائف ہے۔ میری دوست ہے!"

شاہد یہی کہہ رہا تھا۔ ادوائن بہت بڑی تھی۔ انور کے باندھنے کے بعد بھی کافی بچ رہی تھی۔ اسی چھرے سے اس نے باقی حصہ ادوائن کا کاٹا اور اس عورت کو بھی چارپائی پر لٹا کر جکڑ دیا۔ وہ رونے لگی۔ شاہد نے کہا۔ خبردار آواز نکلی تو چھرا پیٹ میں بھونک دونگا۔

انور نے کہا۔ اب تو میں نے سب کچھ بتا دیا۔ اب تو مجھے چھوڑ دو۔

شاہد نے کہا۔ اتنا بے وقوف مجھے نہ سمجھو۔ تم یہیں بندھے پڑے رہو گے (چھرا پھینک کر) یہ رہا تمہارا چھرا۔ اس مصیبت سے تمہیں یاسمین نجات دلائے گی یا شاکر صاحب۔ میں جاتا ہوں۔ باہر سے دروازہ بند کرکے جب وہ انتظار کرتے کرتے تھک جائیں گے۔ تو آپ ہی آئیں گے تمہاری خبر لینے۔ انہی کے ساتھ ٹھنڈے ٹھنڈے روانہ ہو جانا۔ ہاں اتنا اور کہہ دیتا ہوں کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ ورنہ بری طرح پھنس جاؤ گے۔

یہ کہہ کر شاہد چلا۔ لیکن پھر رکا۔ اس نے کہا۔

تم لوگ اول درجے کے بدمعاش ہو۔ کوئی کمزور پہلو نہیں چھوڑونگا۔

یہ کہہ کر اس نے کمرہ کی چیزیں دیکھنی شروع کیں۔ الماری میں قلم دوات کاغذ سب موجود تھا۔ اس نے انور کی طرف سے ایک اقرار نامہ لکھا کہ میں شاکر اور یاسمین کی طرف سے شاہد کو مارنے یا مار ڈالنے پر مامور تھا۔ لیکن مقابلہ میں اس سے ہار گیا۔ اس کا اقرار نامہ لکھتا ہوں۔

یہ بیان لکھ کر اس نے انور سے کہا۔ دستخط کرو۔

انور نے دستخط کر دیئے۔ شاہد نے شکریہ ادا کیا۔ کمرہ کے دروازہ کی باہر سے کنڈی لگائی پھر صحن طے کرتا ہوا باہر کے دروازہ تک پہنچا۔ جسے اندر سے انور نے آتے وقت بند کر لیا تھا۔ شاہد اسے کھول کر باہر نکلا۔ باہر کے دروازے کی بھی اس نے زنجیر چڑھا دی۔ اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

باب ٣٠

ناکامی تدبیر

بڑی دیر ہو گئی۔ انور واپس نہیں آیا۔ یاسمین کی آنکھیں راستہ دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں۔ شاکر کو بھی الجھن ہونے لگی۔ وہ کمرہ میں ٹہل رہا تھا۔ اور یاسمین بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی تھی۔ اس نے شاکر سے کہا۔

"انور نہیں آیا ابھی تک"

"ہاں بھی میں بھی سوچ رہا ہوں"

"کہیں کچھ پٹ تو نہیں ہو گیا معاملہ"

"کیا کہوں میں خود حیران ہوں۔"

"تو جاؤ دیکھ آؤ جا کر۔"

"میں چلا تو جاؤں۔ لیکن ذرا احتیاط کے خیال سے رک رہا ہوں۔"

"اے بھاڑ میں گئی تمہاری احتیاط۔ یہاں تو اس کی جان کا سوال پیدا ہو رہا ہے

اور تم ہو کہ اپنی احتیاط کا راگ الاپے جا رہے ہو۔ اٹھو جاؤ نا جانے کیوں مجھے ہول سا ہو رہا ہے اس وقت۔"

"جاتا ہوں۔ دس پانچ منٹ اور انتظار کر لو۔"

"میں سر پھوڑ لوں گی اپنا ہیں۔ اے واہ۔"

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

"میں اپنے انور کو تم سے لوں گی۔"

یہ کہتے کہتے یاسمین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ رونے لگی۔

شاکر نے کہا۔

"ارے تم تو رونے لگیں۔ اچھا لو۔ جلدی سے آنسو پونچھ ڈالو۔ میں جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر شاکر باہر نکلا۔ انور نے اپنا سارا پروگرام اور ساری اسکیم پہلے ہی سے یاسمین اور شاکر کی کانفرنس میں منظور کرا لی تھی۔ ایک ایک بات بتا دی تھی۔ وہ کیا کرے گا۔ اس کا مرکز عمل کہاں ہو گا۔ لہٰذا شاکر کو منزل مقصود تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی۔

اس نے ایک گاڑی لی اور موقعہ واردات پر روانہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اس محلہ میں پہنچ گیا۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوا اس گھر پر پہنچا جو عرصہ سے خالی تھا۔ مگر اسی ضرورت سے انور نے ایک دوسرے شخص کے نام پر کرایہ سے لیا تھا۔

شاکر نے دیکھا۔ دروازہ کی زنجیر باہر سے لگی ہوئی ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ انور یہاں آیا ہی نہیں؟ اگر آیا تو کیا اپنا کام کر کے چلا گیا؟ لیکن زنجیر میں تالا کیوں نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے وہ کہیں اور گیا ہو اور ابھی آنا ہو۔ کیوں نہ میں اندر جا کر

بیٹھوں اور وہیں انتظار کروں۔

یہ سوچ کر وہ زنجیر کھول کر اندر داخل ہوا۔ گھر میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ صحن سے ٹہلنے لگا۔ کمرے کے اندر سے کچھ گھٹی گھٹی فریاد نما باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے کان کھڑے ہوئے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ کمرہ باہر سے بند ہے اور اندر سے باتوں کی آواز آ رہی ہے۔ وہ بھوت پریت کا کچھ زیادہ قائل نہیں تھا۔ لیکن کبھی کبھی نازک مواقع پر وہ ان کے وجود کا انکار بھی نہیں کرتا تھا۔

پہلے تو اس نے سوچا چل دے یہاں سے۔ لیکن پھر خیال آیا۔ یاسمین کو کیا جواب دے گا؟ ہمت کر کے وہ آگے بڑھا۔ کمرے کے پاس پہنچا۔ دراڑ سے جھانکنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔ آوازیں برابر آتے جا رہی تھی۔ ایک آواز عورت کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ وہ رو رہی ہے۔ دوسری آواز مرد کی تھی۔ وہ کچھ غصہ کر رہا تھا۔ ارے یہ کیا کھولوں دروازہ؟

ہمت کر کے اس نے دروازہ کھولا۔ اس کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا اس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ وہ پہلوانوں کا پہلوان انور ایک مرد ضعیف کی طرح بندھا ہوا پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے اور غصہ کے شعلے بھی نکل رہے تھے۔

سامنے چارپائی پر گلشن جکڑی ہوئی پڑی تھی۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اور انور کو ایک ایک منہ میں سو سو گالیاں دے رہی تھی۔ چھری اگر دور نہ ہوتی۔ تو جس کے ہاتھ میں بھی آ جاتی۔ وہ دوسرے پر حملہ کر بیٹھتا۔

شاکر آگے بڑھا۔ اس نے انور اور گلشن کو قید و بند سے رہا کیا۔ پوچھا۔

"یہ کیا ہوا۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ کچھ بتاؤ تو۔"

انور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مونچھوں پر تاؤ دے دے کر کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ اب شاکر گلشن کی طرف مخاطب ہوا۔ اس نے کہا "خدا کی بندی تو ہی بتا۔ کیا گزری شکار کرنے کے بجائے تم لوگ خود کیسے شکار ہوئے۔"

گلشن نے سارا واقعہ شاکر کو بتا دیا۔ وہ دم بخود ہو کر سنتا رہا۔ سوچنے لگا یہ تدبیر بھی الٹی ہو گئی۔ یہ وار بھی خالی گیا۔

اس نے انور سے کہا "میں یاسمین کے پاس جاتا ہوں۔ تم گلشن کو اس کے گھر چھوڑ کر آؤ تو وہیں باتیں ہوں گی۔"

یاسمین نے دیکھا۔ شاکر جیسا گیا تھا۔ ویسا ہی اکیلا واپس آ رہا ہے۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"اور انور؟"

"آتا ہے ابھی وہ تمہارا رستم۔"

اس طنز کو یاسمین نے محسوس کر لیا۔ بولی۔

"تمہارے سامنے کون رستمی کا دعوے کر سکتا ہے۔ ایسے بہادر بھی دنیا نے کم دیکھے ہوں گے۔ جو اپنے چھوٹے بھائی اور......!"

"چپ رہو یاسمین"

"اسے ہے غصہ میں ہیں سرکار۔"

"پھر وہی بک بک"

یاسمین نے اطمینان سے گوری منہ میں داب کر اطمینان سے جواب دینے کا

ارادہ کیا تھا کہ انور نیل مست کی طرح آتا دکھائی دیا۔ مونچھوں پر اس وقت بھی وہ تاؤ دے رہا تھا۔ یاسمین نے اس سے پوچھا۔

"کہو کیا کر آئے انور؟"

"کچھ نہیں"

"شکار نکل گیا ہاتھ سے؟"

"ہاں!"

"تمہارے ہاتھ سے؟"

"کہہ تو دیا۔ ہاں"

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ شاکر نے کہا۔ اب کے اگر کہیں تم پھر کوئی سوال کر بیٹھتیں۔ اس سے تو شاہد کا سارا بدلہ تم سے لے لیتا۔

"یاسمین بولی۔ شاہد نے کیا کیا انور کے ساتھ؟"

"بلا لو انور کو۔ پوچھ لو اس سے"

"اسے تمہی بتا دو گے تو کیا ہو جائے گا۔"

شاکر نے جو کچھ دیکھا تھا۔ اس کی تفصیل بیان کرنا شروع کی۔ یاسمین سنتی جاتی تھی اور چہرہ کی سفیدی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی جاتی تھی۔ سب کچھ سن چکنے کے بعد اس نے کہا۔

"پھر اب؟"

"اب کیا ہو سکتا ہے۔ یہ آخری تیر تھا جو خالی گیا۔"

"نصیبہ زوروں پر ہے شاہد کا۔"

"یہی سمجھ لو۔"

"موت بھی نہیں آجاتی کمبخت کو۔"

"ایسے لوگ بڑے سخت جان ہو جاتے ہیں۔"

"بس تو جاؤ۔ دلہن بناؤ جا کے ثریا کو۔"

"ہاں! اب اسی کی کسر رہ گئی ہے۔"

دانتوں تلے زبان داب کی۔ "ہائے کیسا اندھیر ہو رہا ہے یہ!"

باب ۳۱

بھائی بہن کی باتیں

دوسرے دن حسب معمول شاہد زہرہ کے ہاں گیا۔ دیکھتے ہی زہرہ بولی۔

"کل کہاں رہ گئے تھے تم؟"

"ایک جلسہ میں چلا گیا تھا۔ دیر ہو گئی نہیں آ سکا۔"

"جلسہ اب شام کے بجائے صبح صبح ہی ہونے لگے۔ مجھ سے اڑتے ہو کیوں؟"

شاہد مسکرانے لگا۔ زہرہ نے کہا۔

"سنتے ہو؟"

"سن رہا ہوں"

"اماں نے تمہارے لئے ایک چاند سی دلہن ڈھونڈھ لی۔"

"اور مجھے خبر بھی نہیں!"

"دے تو رہی ہوں خبر"

"اس طرح کہیں شادی ہوتی ہے؟"

"پھر کس طرح ہوتی ہے شادی؟"

"نہ میں نے اسے دیکھا نہ اس نے مجھے دیکھا۔ نہ وہ مجھے جانے نہ میں اسے جانوں۔ لیکن بات پکی ہو گئی اور سہرا بندھنے لگا۔ کوئی بچوں کا کھیل ہے یہ؟"

"تو آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"شادی نہیں کرو گے؟"

"اپنی پسند سے کرونگا۔"

"تو کب جب بوڑھے ہو جاؤ گے؟"

"تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟"

"میری زندگی تو جیسی بری بھلی گذرنی تھی گذر گئی۔ تمہاری زندگی تو قرینہ سے راہ پر لگادوں۔ یہ سکھ میرے لئے کم ہے؟"

"اچھا تو سن لو خوش خبری تم بھی کیا یاد کرو گی؟"

"ہاں کہو"

"میں نے شادی کر لی۔"

"ایں؟ سچ؟"

"ہاں ہاں بھئی۔ شادی ہو گئی میری۔"

"کب؟ کس سے؟"

"چند دن ہوئے ایک عورت سے۔"

"کون ہے وہ عورت؟"

"تم سنوگی تو چونک پڑوگی۔"

"تجھے میرے سر کی قسم بتا کون ہے وہ؟"

"بتاؤ نا؟"

"ہاں ہاں کہہ تو رہی ہوں۔"

"پہلے منہ میٹھا کرو پھر بتائیں گے۔"

"پہلے بتا دو۔ پھر منہ میٹھا کریں گے۔"

"نا بھئی اس کی سند نہیں۔"

"یہ میں نے اپنے سر کی قسم دی ہے تجھے۔"

"ثریا سے"

"کون ثریا؟"

"شاکر صاحب کی چھوٹی بہن"

"چپ۔ پاگل کہیں کا۔ شاکر صاحب نے سن لیا تو خیر نہیں ہے تیری"

"کچھ بھی تو نہ کرسکے میرا۔ وہ تو گئے منہ دیکھتے ہوئے۔"

"شاہد ہنسی مذاق پھر کرلینا۔ پہلے بات بتاؤ۔"

شاہد نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"خدا کی قسم میری شادی ثریا سے ہوگئی ہے۔"

"ارے یہ کیسے؟ تجھے کہاں مل گئی وہ؟"

شاہد نے اپنی اور ثریا کی ملاقات۔ پھر ربط و محبت۔ پھر عہد وفا کی ساری داستان

سنادی۔ زہرہ نے پوچھا۔

"اور شاکر صاحب نے بھی منظور کرلیا؟"

"انہوں نے تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مخالفت میں۔"

"پھر کیسے ہوئی یہ شادی؟"

"کیسے ہوئی۔ یہ بھی خوب۔ رہی میاں بیوی راضی تو کیا کرے قاضی"

زہرہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"ادھوری بات میں مزا نہیں آتا۔ سب کچھ بتاؤ شروع سے آخر تک۔"

شاہد نے شادی کے بعد کے بھی تمام قصے اسے سنا دیے اور یہ بھی بتا دیا کہ منصور اس کا طرفدار ہے۔ اسی کی وجہ سے شاکر کی ایک نہ چل سکی۔ اتنے میں بڑی بی آگئیں ——— زہرہ اور شاہد کی اماں جان ——— زہرہ سے چھوٹتے ہی کہا۔

"لو اماں اور سنو۔"

"بیٹی میں نہیں سنتی۔ تمہیں تو ہر وقت چہلیں سوجھتی رہتی ہیں۔"

"سچ بڑے مزے کی بات ہے۔ شاہد کی شادی کی۔"

اب تو بڑی بی کا بھی طوفان اشتیاق جوش پر آیا۔ انہوں نے بے تابی کے ساتھ پوچھا۔

"کیا بات ہے بتاؤ نا!"

"جاؤ نہیں بتاتے تمہیں ہم۔ ہم خفا ہیں تم سے۔"

بڑی بی شاہد کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ہاں بیٹا! کیا خبر ہے؟"

زہرہ نے شاہد کو آنکھ ماردی۔ وہ بھی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ بڑی بی بگڑ گئیں۔

"شروع ہو گئیں چہلیں۔ بہن بھائی کی۔ ارے لگا لینا ٹھٹھے جتنے جی چاہے۔ بات تو بتاؤ۔"

لیکن شاہد اور زہرہ ہنستے جا رہے تھے۔ بڑی بی خفا ہو گئیں۔ وہ اٹھ کر جانے لگیں۔ زہرہ نے ان کا آنچل پکڑ لیا۔

"میری اماں نہ جاؤ۔"

"(بیٹھ کر) تو بتاؤ"

"نہیں بتاتے"۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ پھر بڑی بڑے عزم کے ساتھ اٹھیں۔ شاہد کو ترس آگیا۔ اس نے کہا بتا بھی دو آپا۔"

زہرہ کی زبان سے ساری کہانی سن کر بڑی بی مارے خوشی کے جامہ سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کے بوڑھے چہرے پر اس وقت جوانی کی سرخی دوڑ رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔

"بہت جلا ہوگا شاکر"

"اماں ان کا ذکر نہ کرو۔"

"کیوں نہ کروں بیٹی۔ آدمی اتنا بھی مغرور نہ ہو۔ یاد ہے۔ جب تم نے باتوں باتوں میں کہا تھا۔ شاہد کی شادی ثریا سے کر دو۔ تو کیا کہا تھا اس نے؟"

"خوب یاد ہے۔ چھوڑو ان باتوں کو۔"

"تم ہو بھی ولی اللہ ہم تو نہیں ہیں۔ ہمارا تو جی جلا ہوا ہے ہم تو ٹوکے گی۔

پر چوٹ کہیں گے۔ بڑے بول کا سر نیچا۔ بڑا اونچا سمجھ رہے تھے اپنے تئیں۔ جیسے حسب نسب کا انہی پر خاتمہ ہو گیا ہے۔ باقی سب ذلیل ہیں۔ تُچھ ہیں۔"

"اماں میں کہہ رہی ہوں چپ رہو۔"

"میں تو جی چاہے گا کہوں گی۔ بُرا لگتا ہے تو جاؤ اپنے کمرہ میں بیٹھو۔"

"چل شاہد چلیں۔"

یہ کہہ کر زہرہ اپنے ساتھ شاہد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرہ میں لے گئی۔ بڑی بی بدستور اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی گڑگڑی پیتی جا رہی تھیں اور بڑبڑاتی جا رہی تھیں۔ کبھی زیر لب اور کبھی آواز بلند۔ لیکن بالکل تنہا۔

باب ۳۲

سرگزشت حیات

شاہد اور زہرہ کمرہ میں آکر بیٹھ گئے۔ اس وقت دونوں سنجیدہ تھے۔ وہ شوخی جو ابھی چند منٹ پہلے تک زہرہ اور شاہد پر چھائی ہوئی تھی اب دور ہو چکی تھی۔ دونوں کسی گہری سوچ میں تھے۔

دس پندرہ منٹ گذر گئے۔ لیکن دونوں کھوئے کھوئے سے بیٹھے رہے۔ زہرہ نے طلسم سکوت توڑا۔

"کیا سوچ رہے ہو شاہد؟"

"کچھ نہیں۔ یونہی۔"

"کوئی بات ہے ضرور"

"ہاں ایک بات سوچ تو رہا ہوں"

"ہم بھی سنیں"

"میں یہ سوچ رہا ہوں شاکر صاحب ہمیں ذلیل اور نیچ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے تمہارے کہنے کے باوجود وہ ثریا کی شادی مجھ سے کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔"

"ہاں تو"

"یہی خیال اگر کبھی ثریا کے دل میں بھی آگیا۔"

"تو کیا ہوگا؟"

"ہماری زندگی تلخ ہو جائے گی۔ ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

"لیکن یہ خیال اسے آنے کیوں لگا؟"

"یہ نہ کہو۔ آدمی کا خیال بدل بھی سکتا ہے۔"

"لیکن ثریا ایسی ہوتی۔ تو تم سے اتنی مخالفت گھر والوں کی مول لے کر شادی کیوں کرتی۔ بھائی کو اپنا دشمن کیوں بناتی؟ رسوائی اور بدنامی کیوں مول لیتی؟"

"یہ تو تم سچ کہہ رہی ہو۔ لیکن یہ خیال میرے دل میں کھٹکتا ہے۔"

"آخر کیوں۔ وہ بڑے شریف ہیں۔ تو ہم کون سے کمینے ہیں"

"کیا کہہ رہی ہو آپا؟ اس دنیا کے سامنے اس سماج کے سامنے ہم شرافت کا دعوے کر سکتے ہیں۔ منہ نوچ لے گی یہ سماج ہمارا تمہارا۔"

"ہم بھی اس کا منہ نوچ سکتے ہیں۔ ہم بھی اسے ٹھکرا سکتے ہیں۔"

"ہم خود اپنا منہ نوچ سکتے ہیں۔ خود اپنے ٹھوکر لگا سکتے ہیں۔ سماج کا منہ اتنا اونچا ہے کہ ہم ہمالیہ پر چڑھ کر بھی اسے نہیں پا سکتے۔ وہ اتنی سخت ہے کہ اسے اگر ہم نے ٹھوکر لگائی تو ہمارے اپنے پاؤں لہولہان ہو جائیں گے۔"

"میں خوب جانتی ہوں۔ اس دنیا کو۔ اس سماج کو۔ یہی دنیا اور سماج ہے جس

rekhta

نے مجھے رنڈی بننے پر مجبور کیا۔"

"اور اماں کو؟"

"اماں کی میں نہیں کہتی۔ اپنی کہتی ہوں۔"

آخر کس طرح؟

"کیا کرو گے یہ قصہ سن کر؟"

"ضرور سنوں گا۔"

"شاید تم میرے بھائی ہو۔ اس دنیا میں تم ہی ایک میرے ہو۔ تمہیں یاد ہوگا۔ وہ میں ہی تھی جس نے تمہیں اس گھر سے باہر رہنے اور یہاں کے ماحول سے دور رہنے پر مجبور کیا تھا۔

"ہاں خوب یاد ہے۔"

"کوئی مادر زاد رنڈی ہو سکتی ہے؟"

"تو کیا اماں تمہاری اور میری ماں نہیں ہیں؟"

"ماں سے بڑھ کر ہیں۔ لیکن ماں نہیں ہیں۔"

"ایں۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"کہانی بیان کر رہی ہوں اپنی"

"چبا چبا کے باتیں کیوں کر رہی ہو۔ صاف صاف کہو نا"

"سنو۔ آج تمہیں وہ راز بتاتی ہوں جسے میں اپنے ساتھ قبر میں لے جانے کا ارادہ کر چکی تھی۔ لیکن تمہیں افسردہ اور مغموم نہیں دیکھ سکتی۔ اسی لئے وہ عہد توڑتے ہوئے جو میں نے خود سے کیا تھا"

شاہد خاموش بیٹھا ہوا تھا اور زہرہ کہہ رہی تھی۔

"آج سے بیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں ۱۲ - ۱۳ برس کی ایک الہڑ لڑکی تھی۔ اور تم تین برس کے ننھے بچے۔ ہمارے تمہارے ماں باپ زندہ تھے۔ سوہ جوہی کی طرح پاک اور معصوم ماں آج بھی میری آنکھوں میں بسی ہوئی ہے۔ وہ فرشتہ سے زیادہ نیک اور صالح باپ آج بھی اس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔

سارے شہر میں ہمارا گھرانا شرافت اور عزت کے لحاظ سے سر بلند تھا۔ اباجان کسی دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ ڈھائی سو روپیہ ماہوار انہیں تنخواہ ملتی تھی۔ بڑے سکھ اور چین سے بسر ہو رہی تھی۔ ہمارا گھر جنت کا نمونہ بنا ہوا تھا۔

"اباجان بیمار پڑے ڈیڑھ برس تک بیمار رہے۔ نوکری چھوٹ گئی۔ زیور بک گئے۔ برتن فروخت ہو گئے۔ جہاں تک قرض مل سکا قرض لیا اور اباجان کے دوا علاج میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ لیکن ان کے دن پورے ہو چکے تھے۔ ایک روز وہ میری بے بس ماں (آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے) کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دنیا سے سدھار گئے۔

یہ غم اماں نہ سہہ سکیں۔ وہ بھی بیمار پڑ گئیں۔ اب ہماری آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ہمارے کھاتے پیتے عزیز تھے۔ مال دار اور دولت مند رشتہ دار تھے۔ بزرگ کا سا اور یار روزگار اباجان کے دوست تھے۔ ان کی موت پر سب روئے تھے۔ لیکن ان کی دکھ سے کراہتی ہوئی بیوی۔ بھوک سے روتی ہوئی لڑکی اور لڑکے پر وہ ہنس رہے تھے، ہمارا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ کوئی ہمدرد اور غم خوار نہیں دکھائی دیتا تھا۔

اباجان کے ایک پرانے دوست تھے۔ خان بہادر صاحب بڑے کھلے

کے آدمی تھے۔ زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنے اور ابا جان کے ایک دوست کی معرفت میرے ساتھ اپنا پیام بھیجا۔ اماں سن کر دنگ رہ گئیں۔ انہیں بڑا غصّہ آیا۔ لیکن اپنی بے بسی دیکھ کر چپ ہو گئیں۔ اور آخر انہوں نے یہ پیام منظور کر لیا۔ نہ منظور کرتیں تو فاقہ کا بھیانک دیو سامنے کھڑا تھا۔ مجھے اور تمہیں کھانے کے لیے اس دیو کو دیکھ کر وہ لرز اٹھیں اور جس بات کو مانتے ہوئے ان کا دل لرز رہا تھا۔ اسے ماننے پر وہ مجبور ہو گئیں۔

خان بہادر صاحب نے ۵۰ روپیہ ماہوار وثیقہ اماں کا مقرر کر دیا اور بڑے ٹھاٹھ سے مجھے دلہن بنا کر اپنے گھر لے گئے۔

خان بہادر صاحب کا گھر ایک اچھا خاصا محل تھا۔ نوکروں اور ماماؤں کی پلٹن ٹھیکیدار تھے۔ خوب دولت جمع کی تھی۔ انہوں نے میرے اوپر تو بری طرح ریجھے ہوئے تھے۔ میں انہیں ابا جان کی زندگی میں چچا کہتی تھی۔ ان کی گودیوں میں کھیلی تھی۔ ان کی سفید نورانی داڑھی سے کھیلی تھی۔ ان کے زرق برق کپڑوں پر میں نے پیشاب کیا تھا۔ میں سیانی ہونے کے بعد ان کی مہیب صورت دیکھ کر لرز جاتی تھی۔ ابا جان سے اتنا نہیں ڈرتی تھی۔ وہ آج دولہا بنے ہوئے تھے۔ اور میں ان کی دلہن بنائی جا رہی تھی۔ اور یہ تمہاری سماج دور سے کھڑی کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے نہ میرا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا۔ اور نہ خان بہادر کے سینہ پر گھونسہ مار کے انہیں پیچھے ہٹایا۔

میں ان کے آغوش میں پہنچی اور وہ اس بے خودی سے مجھ پر ٹوٹ پڑتے کہ میں اپنا رونا تک بھول جاتی۔

میرا غم دیکھ دیکھ کر اماں مجھ سے زیادہ کڑھتی تھیں۔ چند ہی مہینے میں اس غم

نے انہیں کھا لیا۔

اب تم میرے پاس آ گئے۔ اب میں تمہاری ماں بھی تھی۔ اور بہن بھی۔ میری محبت کے مرکز صرف تم بنے ہوئے تھے۔ خان بہادر کی محبت آمیز باتوں سے میرا جی متلاتا تھا۔ میں ان سے گھن کرتی تھی۔ جتنی دیر ان کے پاس مجھے رہنا پڑتا تھا۔ وہ وقت ہول دل میں صرف ہوتا تھا۔

خان بہادر صاحب ذیابیطس کے پرانے مریض تھے۔ کاربنکل نکلا۔ آپریشن ہوا۔ وہ جانبر نہ ہو سکے۔

اب میں خوش تھی۔ کہ بیوگی کے دن سکھ اور چین سے گزار دوں گی۔ لیکن ان کے جوان لڑکے تھے۔ لڑکیاں تھیں۔ میرے علاوہ دو بیویاں تھیں۔ سب نے سازش کی اور صاف صاف اعلان کر دیا۔ کہ خان بہادر صاحب تیرے شوہر نہیں تھے۔ تیرا نہ جائداد میں حصّہ ہے نہ اسباب اثاثہ میں۔ جہاں تیرے سینگ سمائیں چلی جا!

جس سماج کے سامنے میرا بیاہ ہوا تھا۔ اسی سماج نے تسلیم کر لیا کہ میں خان بہادر کی بیوی نہیں ہوں۔ چار مہینے کے اندر میں بیوی بنی۔ بیوہ ہوئی اور حق زوجیت سے محروم کر دی گئی۔ وہ سماج جو غریبوں کی برائیاں کرید کرید کر نکالتی ہے۔ امیروں کی بڑی سے بڑی برائیاں بھی اس کی نظر میں نہیں سماتیں۔

میرا زیور چھین لیا گیا۔ اور مجھے چند جوڑے کپڑے دے کر نکال دیا گیا۔ اب میں کہاں جاتی۔ تمہاری انگلی پکڑی اور سیدھی ایک وکیل صاحب کے ہاں پہنچی۔ وہ بڑی ہمدردی سے پیش آئے۔ کہنے لگے۔ جب تک مقدمہ نہ جیت لو۔ تم میری مہمان ہو۔ میں پیروی کروں گا اور خان بہادر کے بچوں سے ایک ایک پائی اگلوا لوں گا۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میں سمجھی یہ انسان کے روپ میں فرشتہ ہے۔ رات کو میں اپنے کمرہ میں سو رہی تھی۔ کہ مجھے اپنے سینہ پر کوئی چیز رینگتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے دیکھا یہ وکیل صاحب کا ہاتھ تھا۔ میں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اٹھ بیٹھی اور غصہ سے پوچھا۔

"آپ یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"تمہارے پاس آیا تھا اپنی فیس لینے"

"لیکن فیس تو میرے پاس نہیں ہے"

"وکیل صاحب نے مجھے سمجھایا۔ اس دنیا میں ہر چیز بکتی ہے۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ تمہارے پاس فیس دینے کے لئے چھن چھناتے ہوئے روپے نہیں ہیں لیکن جوانی ہے۔ میں روپیہ کے عوض جوانی کا سودا کرونگا۔ میں تمہیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا۔ تم اس سودے سے انکار کرو گی۔ لیکن اگر تمہیں انکار ہو۔ تو میں زبردستی نہیں کرتا۔ کمرہ کا دروازہ میں ابھی کھول دونگا۔ تم جا سکتی ہو۔"

میں جانے کے لئے کھسک گئی تھی۔ لیکن فوراً خیال آگیا جاؤں کہاں میرا ہے کون۔ کون دے گا پناہ؟ میں پھر بیٹھ گئی۔ وکیل صاحب نے بڑی شفقت کے ساتھ میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ مجھے اپنے پہلو کی زینت بنا لیا۔ میرے چہرہ اور بالوں سے ان کی انگلیاں کھیلنے لگیں۔ انہوں نے کہا۔ تم بڑی سمجھ دار ہو۔ پھر وہ میری جوانی سے اپنی فیس وصول کرنے لگے۔

ایک ہفتہ تک روزانہ وہ اپنی فیس مجھ سے وصول کرتے رہے۔ لیکن مجھے ان کے ذکر سے معلوم ہوا کہ وہ خان بہادر صاحب کے دوست ہیں۔ اور ان کے لڑکوں کو

اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔

"ایک روز میں نے تقاضا کیا۔ آخر آپ مقدمہ کیوں نہیں دائر کرتے۔ چھوٹی سی فیس لے کر انہوں نے کہا۔ جلدی کاہے کی ہے ارے ابھی کھا رہی ہو۔ پی رہی ہو۔ پہن رہی ہو۔ رہ رہی ہو۔ ہو جائے گا مقدمہ بھی دائر۔"

ایک روز میں نے سنا۔ کل وکیل صاحب کی بیوی میکہ سے آ رہی ہیں۔ وکیل صاحب گھبرائے۔ میرے پاس آئے۔ کہنے لگے۔ سنتی ہو۔ وہ کل آ رہی ہیں۔ ان کا مزاج ذرا خراب ہے۔ اب تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ملازموں کی جو کوٹھڑی ہے اس میں چلی جاؤ تم۔ میں کہہ دونگا تمہارے لئے ایک اچھی سی ملاز تلاش کرلی ہے۔ بظاہر ملازمہ بن کر رہنا۔ اور ویسے میرے دل پر حکومت کرتی رہنا۔ یہ کہہ کر وہ اپنی فیس کی ایک قسط پھر وصول کرنے والے تھے۔ مگر میں نے انہیں موقعہ نہ دیا۔ اب موکل سے ملازمہ بن گئی۔

وکیل صاحب کی بیوی آ گئیں۔ غصہ تو ان کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ ایک روز کہیں انہوں نے وکیل صاحب کو مجھ سے فیس وصول کرتے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ قیامت آگئ وکیل صاحب کی تو نہ جانے انہوں نے کیا گت بنائی۔ مگر مجھے گھر سے نکال باہر کر دیا ——— سماج اب بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وکیل صاحب اس کے سرتاج بنے رہے۔ اور میں راندۂ درگاہ بن گئی۔

وکیل صاحب کے ہاں سے اپنے ننھے بھائی کی انگلی پکڑے باہر نکلی۔ یا اللہ اب کہاں جاؤں؟ نہ راستہ سے واقف نہ منزل سے۔ لیکن قدم برابر آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک بیل گاڑی میں ایک ٹھاٹھ دار عورت بیٹھی دکھائی دی۔ شہر کے پاس ایک

گاؤں تھا۔ اس کی زمینداری تھی۔ شہر کچھ چیزیں خریدنے آئی تھیں۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ میں سبھوں کی طرف سمجھیں کوئی بھکارن ہے۔ گاڑی رکوا کر انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں گئی۔ انہوں نے پوچھا۔

"کون ہے تو؟ بھکارن؟"

"ہاں بھکارن۔" میں نے جواب دیا

"کیوں بھیک مانگتی ہے تو؟"

"تو پیٹ کیسے بھرے؟"

"نوکری کرے گی؟ ہمارے بچے کو کھلایا کرنا"

"کروں گی نوکری"

"تنخواہ کیا لے گی؟"

"جو آپ دے دیجئے"

"دو روپیہ مہینہ اور کھانا"

"یہی سہی"

"عید بقر عید پر انعام"

بہت اچھا

"تو آ بیٹھ جا گاڑی پر"

"میں گاڑی پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے میرے بھائی کی طرف دیکھا۔ پوچھا۔ کون ہے تیرا؟ ائی؟ میں نے کہا۔ ہاں میرا بھائی ہے یہ۔ پوچھا۔ ماں باپ مر گئے تیرے۔ میں رونے لگی۔ وہ ن چلانے لگیں۔

زمیندار کی بیوی بڑی اچھی عورت تھی۔ لیکن زمیندار قہر تھا خدا کا۔ اس نے مجھے دیکھا مسکرایا اور باہر چلا گیا۔ میں اس کی مسکراہٹ دیکھ کر دہل گئی۔ اس مسکراہٹ میں شرارت ناچ رہی تھی۔

دو تین روز اطمینان سے گذرے۔ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ ایک روز ٹھیک دوپہر کے وقت جب گھر کے سب لوگ سو رہے تھے۔ زمیندار صاحب آئے انہوں نے اشارہ سے مجھے بلایا۔ میں گئی ان کے پاس۔ کہنے لگے۔ بیگم تو سو رہی ہیں۔ تو چل میرے سر میں تیل داب۔ درد ہو رہا ہے بڑے زور کا۔

میں ان کے ساتھ ساتھ اندر گئی۔ انہوں نے بڑی بے تکلفی سے گویا سب کچھ جانتے ہے۔ کمرہ کا دروازہ بند کر لیا۔ میں منہ دیکھتی رہ گئی۔ ان کا کہنے لگے عجب پگلی ہے۔ منہ کیا دیکھ رہی ہے میرا۔ چل ادھر یہ کہہ کر انہوں نے اپنے پلنگ پر مجھے اس طرح ڈال دیا۔ جس طرح قصائی بکری کو ذبح کرتے وقت پچھاڑ دیتا ہے۔

پھر تو یہ روز کا معمول ہو گیا۔ جب دیکھو جب ان کے سر مبارک میں درد ہو رہا ہے۔ ان کے سر درد اس وقت جاتا تھا۔ جب میری رگ رگ میں جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگتا تھا۔

سماج کی یہ حالت تھی کہ میں تو کسی شمار قطار میں نہیں تھی اور زمیندار صاحب نہ ہوں تو سماج بیوہ معلوم ہونے لگتی تھی۔

زمیندار کی بیوی [illegible] شفقت کی تھی مجھ سے زیادہ زمیندار صاحب سے زمیندار صاحب ایک روز کسی کام سے شہر گئے اور بیگم صاحب نے کیا کیا عید و [illegible] میرا نکاح کر دیا۔ اور میں فوراً اس کے گھر رخصت کر دی گئی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ مگر

اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بالکل گنوار تھا۔ میں تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھی۔ مہذب تھی۔ نستعلیق تھی۔ لیکن وہ میرا شوہر تھا۔ خداوند مجازی اور میں اس کی بیوی تھی بے چاری کنیز اور سماج یہ تماشا دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ کسی مل میں نوکر تھا۔ سال بھر میں دو چار دفعہ ہفتہ دو ہفتہ کے لئے اپنے گھر اور کھیت کی خبر لینے آ جاتا تھا۔ اس دفعہ بھی وہ ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں رہا۔ شہر جانے لگا۔ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ جاہل تھا۔ میں مجبور۔ جو وہ کہتا تھا مجھے کرنا پڑتا تھا۔

پھر اس نے ایک بڈھے سے سو روپیہ لے کر مجھے طلاق دے دی اور مجبور کیا کہ میں اس سے شادی کروں۔ میں نے انکار کیا تو وہ چھرا لے کر نکل آیا کہ مار ڈالوں گا تجھے۔ ناچار اس بڈھے جاہل سے نکاح کرنا پڑا ——— سماج کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اور وہ یہ زندہ ناچ گانا بڑے شوق سے دیکھ اور سن رہی تھی۔

اس نئے گھر میں مشکل سے ایک مہینہ گذرا ہوگا کہ نئے شوہر صاحب شراب کے نشہ میں مست ڈگمگاتے ہوئے کوئی شعر گاتے ہوئے تشریف لائے۔ فرمانے لگے تانگہ کھڑا ہے نیچے چل۔ میں نے کہا۔ کہاں لئے چلتے ہو مجھے؟ کہنے لگے۔ جلتی ہے سالی یا دوں ایک گھونسہ کھینچ کے پیٹھ پر۔ اب بھلا سوال و جواب کی کہاں گنجائش تھی۔ اس نے تانگے پر مجھے اور میرے بھائی کو سوار کیا۔ تانگہ چل پڑا۔

ہم ایک گلی کے نکڑ پر پہنچے۔ شوہر صاحب کے اشارہ سے تانگہ رک گیا۔ انہوں نے تانگہ والے کو رخصت کیا۔ آگے آگے وہ پیچھے پیچھے میں تین چار مکان چھوڑ کے ایک بالاخانہ پر چڑھ گئے۔ سامنے ایک ادھیڑ عورت بیٹھی تھی۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے۔

میں ایک کونے میں اپنے بھائی کے ساتھ دبک کر بیٹھ گئی۔ شوہر صاحب نے اس عورت سے میری طرف اشارہ کر کے کہا یہ مال ہے۔ بولو کیا دو گی۔ یہ میرا سودا ہو رہا تھا۔ میں بیچی جا رہی تھی۔ میرے بدن کے رونگٹے سوئی کی طرح کھڑے ہو گئے۔ مجھے چکر آنے لگا۔ لیکن ضبط کئے بیٹھی رہی۔ عورت نے کہا۔ تم بتاؤ کیا لوگے؟

"میں تو دو ہزار سے کوڑی کم نہ لوں گا۔"

"تو ہو چکا سودا۔ چلو اپنی راہ لو۔"

"تو خفا ہو گئیں خالہ سے میں۔ تم ہی تو بتاؤ۔ کیا دو گی؟"

"ڈیڑھ ہزار بہت ہے۔ یہ منظور ہو۔ تو روپیہ گن دوں؟"

"اب تم سے کیا حجت کریں۔ چلو سو روپیہ کم کر دو۔"

"کہہ دیا ڈیڑھ ہزار سے کوڑی زیادہ نہیں دوں گی۔"

وہ عورت مسکرائی۔ شوہر صاحب نے روپے گنے۔ چلتے وقت میری طرف دیکھا میں سمجھی کچھ فرمائیں گے کہنے لگے۔ "ہم نے تجھے طلاق دی طلاق دی طلاق دی۔" یہ کہہ کر ذرا کی ذرا ڈگمگائے۔ بیڑی سلگائی — اور جہاں سے آئے تھے وہاں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ وہ عورت میرے پاس آئی۔ بڑی شفقت سے اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کہنے لگی۔

"روتی کیوں ہو بیٹی! میں تمہیں بڑے آرام سے رکھوں گی۔ میری ایک بیٹی تھی بالکل تمہاری جیسی۔ وہ دق میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ (آنسو آ گئے آنکھوں میں) اس کا غم مجھے کھائے جا رہا ہے۔ میں تمہیں اپنی بیٹی۔ چہیتی لاڈلی بنا کر رکھوں گی۔ غم نہ کرو۔ پونچھ ڈالو آنسو۔"

ان باتوں سے ذرا میری ڈھارس بندھی۔

اس عورت نے ایسا محبت اور شفقت کا برتاؤ کیا۔ جسے میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس نے میری داستان سن لی۔ اسے مجھ سے واقعی ہمدردی ہو گئی اور مجھے سچ مچ اپنی بیٹی کی جگہ سمجھنے لگی۔ میری ہر ضد وہ بڑے چاؤ سے پوری کرتی تھی۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کی بیٹی مر گئی تھی۔ دل کا گھاؤ ابھی تازہ تھا۔ اس نے مجھے بیٹی کی طرح پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ ورنہ رنڈیاں ان لڑکیوں پر جنہیں وہ خریدتی ہیں قیامت کے ظلم ڈھاتی ہیں۔ مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوا۔ یہاں آکر میں پچھلے مظالم بھول گئی۔ مجھے پھولوں کی سیج پر پالا گیا۔

میں بیٹی تھی۔ چاؤ پیار اور لاڈ بھی بہت تھا۔ میرا اب میری نئی ماں کو تعلیم و تربیت کی فکر ہوئی۔ اردو انگریزی کے ماسٹر اور مولوی رکھے گئے۔ گانا سکھانے کے لئے استاد جی مقرر ہوئے۔ ناچ کی تعلیم وہ خود دیتی تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں میں جھک ہو گئی۔ میرے ناچ اور گانے کے رسیا پھر اس اجڑے ہوئے بالاخانے پر آنے لگے جس کمرہ میں کوئی جھانکتا نہیں تھا۔ وہاں اب مجمع لگا رہتا تھا۔ بہت جلد میرے ناچ اور گانے کا شہر بھر پر سکہ بیٹھ گیا۔

اب میری زندگی کا سب سے بڑا اور نازک وقت آیا۔ اماں نے مجھے اپنی بیٹی بنایا تھا۔ اور مجھ سے بھی وہ وہی کام لینا چاہتی تھیں۔ جو اپنی مرحوم بیٹی سے لیا کرتی تھیں۔ میں نے اماں سے کہا۔ اگر تم چاہتی ہو۔ کہ میں زندہ رہوں۔ تمہاری تجوری سونے سے بھر دوں۔ تمہاری دوکان پھر چمکا دوں۔ تو میری ایک بات تمہیں ماننا پڑے گی۔

"انہوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ کون بات؟"

میں نے کہا۔ میں ناچوں گی۔ گاؤں گی جو آمدنی ہوگی وہ صرف تمہاری رہے گی میں ایک پیسہ بھی نہیں طلب کروں گی جو کھلاؤ گی۔ وہ کھاؤں گی۔ جو پہناؤ گی وہ پہنوں گی لیکن کسی غیر مرد سے اکیلے میں نہیں ملوں گی۔ نہ اپنے گھر پر نہ اس کے گھر پر۔ وہ سوچ لگیں۔ انہوں نے محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ بیٹی تیری یہ بات مجھے منظور ہے۔ میری ایک لڑکی مر گئی۔ خدا نے مجھے پلی پلائی جوان جہان دوسری لڑکی بالکل ویسی ہی دے دی۔ اس کا ہر کہا مانوں گی میں۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اماں کے کاندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ انہوں نے میری پیشانی چومی۔ دلاسا دیا۔ بڑے بڑے گاہک آتے۔ اماں کے پاس ہزاروں روپے کے نوٹ انہوں نے بکھیر دیئے۔ اماں کے قدموں پر۔ مگر اماں کا جواب ایک تھا۔ گانا سن لو۔ ناچ دیکھ لو۔ اس سے آگے کوئی بات اگر چاہیئے تو وہ راہ اپنی راہ لو۔ میرے جواہرات اور سونے چاندی کی بڑی سے بڑی رشوت اماں کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی۔ انہوں نے اشارۃً بھی مجھ سے عہد شکنی نہیں کی۔

شاہد! خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں۔ جب سے اس گھر میں آئی ہے تمہاری بہن ویسی ہی پاک ہے۔ جیسی اپنی مرحوم ماں کی گود میں تھی۔ کسی مرد نے ا کے بدن میں ہاتھ نہیں لگایا۔ بڑی سے بڑی ترغیب بھی اسے ڈانواں ڈول نہ کر سکی۔ خود اس کے دل میں بڑے بڑے طوفان اٹھے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس کے پاؤں کبھی نہیں ڈگمگائے۔ وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ جمی رہی دنیا کچھ کہے۔ سماج کچھ کہے۔ لیکن اس کا دل مطمئن ہے۔ اس کے ضمیر میں کوئی خلش چبھن نہیں ہوتی۔

اب تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جس بڑھیا کو ہم اماں کہتے ہیں وہ ہماری ماں نہیں۔ لیکن ماں سے بڑھ کر ہے۔

شاہد کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ زہرہ نے اٹھ کر اسے گلے لگایا اور کہا۔ تو سماج کی پروا کیوں کرتا ہے۔ کیا تجھے اپنی بہن پر فخر نہیں ہے؟ تو ثریا سے کیوں ڈرتا ہے؟ کیا وہ تیری بہن کو اب بھی مجرم سمجھے گی؟ تجھے شاکر کا اندیشہ کیوں ہے۔ وہ میرا سب سے بڑا دشمن ہے۔ لیکن میری عصمت آبی کا سب سے بڑا گواہ وہی ہے۔ وہ میرے خون کا پیاسا ہے۔ لیکن میرے دل میں اس کی جگہ ہے۔ عزت ہے۔ محبت ہے!

بہن بھائی میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بڑی بی آ گئیں۔ آتے ہی برسے لگیں آج تو ایسے ملے ہیں۔ جیسے مدت کے بچھڑے ملے ہوں۔

یہ کہتی ہوئی وہ باورچی خانہ کی طرف چلی گئیں۔

زہرہ نے شاہد سے کہا۔ دیکھو ایک تاکید کرتی ہوں۔ خبردار جب تک اماں زندہ ہیں۔ ان پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا۔ کہ تم بھی اس راز کو جانتے ہو۔ وہ تمہیں بیٹا بنا چکی ہیں۔ ان کا دل پھٹ جائے گا۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا۔ کہ ان کا بیٹا ان کا نہیں رہا؟

"ثریا سے بھی نہ کہوں؟"

اس سے ضرور اس داستان کا جو حصہ مناسب سمجھو کہہ دو۔ لیکن اخفائے راز کی تاکید تم دونوں کے لئے ہے۔ اسے اگر اپنا یہ راز بتاؤ۔ تو یہ عہد لے کر کہ وہ اس کی حفاظت کرے گی۔ امانت میں خیانت نہیں کرے گی۔"

شاہد جب اس کمرہ میں آیا تھا۔ تو اس کا دل بوجھل تھا۔ اب وہاں سے جانے کے لئے اٹھا۔ تو بالکل ہلکا تھا۔ وفورِ مسرت میں ایسا معلوم ہوتا تھا اڑا جا رہا ہے۔

باب ۳۳

ہم راز

شاہد اور ثریا میں کئی روز تک ملاقات نہیں ہوئی۔ شاہد روز کالج جاتا تھا۔ مگر ثریا صنوبر کی دیکھ بھال میں ایسی الجھی رہی۔ کہ کئی روز تک نہ جا سکی۔ آج کئی روز بعد اس کی اور شاہد کی ملاقات کالج کے احاطہ میں ہوئی

شاہد نے کہا۔ اب تو تم بڑے لمبے غوطے لگانے لگی ہو۔ کیا فیل طلبا کی فہرست میں سب سے آگے بڑھ جانے کا ارادہ ہے تمہارا ؟

ثریا مسکرائی۔ کہنے لگی "فیل ہونے ہونگے دوسرے۔ یہاں تو آج تک سے اوّل ہی رہے"

"ہاں۔ لیکن ان غیر حاضریوں کا آخر انجام کیا ہوگا"

"کیا کروں تھیں کچھ ایسی ہی مجبوریاں"

"ہمیں نہیں بتاؤگی؟

"کیا کروگے سن کر؟ بتادوں گی"

"طے ہوا کہ کالج سے واپسی پر دونوں حسب معمول رانی باغ کے اسی کنج پر ملیں اور باتیں کریں۔

آج کالج کی ٹیم، ایک دوسرے کالج کی ٹیم سے میچ کھیلنے والی تھی۔ اس لئے دو گھنٹے پہلے چھٹی ہوگئی۔ لڑکے میچ کی تیاریاں کرنے لگے۔ شاہد اور ثریا اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ کالج میں دو ایک مخصوص دوستوں کے علاوہ کسی کو ثریا اور شاہد کا رشتہ نہیں معلوم تھا۔ اس لئے عام طور پر معزز خواتین و حضرات ان کے ربط ضبط سے کھٹکتے رہتے تھے۔

چھٹی کے بعد سب سے پہلے شاہد اپنی سائیکل پر بیٹھ کر روانہ ہوا اور آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ ثریا اپنی جماعت کی لڑکیوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ اس سے اصرار کر رہی تھیں کہ وہ میچ دیکھنے چلے۔ لیکن وہ منکار کئے جا رہی تھی۔ رونق نے کہا

"بھئی اتنا ہیں زیادہ نہ چھیڑو نہیں تو رو ٹھ جائیں گی"

"ناپید گیا ہوتی"

ہاں بھئی ایسا مذاق بھی کیا کہ آدمی کا دل رونے لگے۔

وردوانہ بولی۔

"آخر پہیلیاں کیوں بجھا رہی ہو۔ کیوں رو دے گی ثریا۔ کیوں اس کا دل رونے لگے گا۔ ارے واہ کوئی بات ہوئی"

رونق نے کہا

"ہاں بڑی بات ہے۔ تم نہیں جانتیں۔ ہم جانتے ہیں"

دردانہ نے بڑے بھولے پن سے کہا۔

"اللہ ہمیں بھی بتا دو نا"

"نہیں بتاتے کسی کا اجارہ" ۔ رونق بڑبڑاتی۔

"بتانا پڑے گا تمہیں" یہ کہہ کر راحت کھلکھلانے لگی۔

رونق نے کہا۔

"بات یہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھئی ہم نہیں بتاتے"

"پھر جل گئیں؟" مہ جبیں بولی۔

"ہمیں شرم آتی ہے"

سب سہیلیوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ ثریا نے ہنستے ہنستے ایک زور کی چٹکی لی۔ رونق کے۔

"بہت چنچل ہو گئی ہے تو!"

"تم سے کم"

"میں نے کیا کیا؟"

"دیکھ لیں گے سب ابھی"

"اونہہ تو دیوانی ہے میں چلی"

یہ کہہ کر وہ چل ہی دی۔

رونق نے کہا۔ "ہاں جلدی جاؤ۔ بڑی دیر سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ بیچارے تمہارے!"

ثریا نے ہاتھ کے اشارہ سے کہا۔

"اچھا سمجھوں گی تجھ سے"

وہ تو چلی گئی اور رونق، دردانہ وغیرہ زور زور سے ہنسنے لگیں اور پھر تیتریوں کی طرح ادھر ادھر اڑ گئیں۔

شاہد کنج عزلت میں ثریا کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ نسیم بہار کی طرح اٹھکھیلیاں کرتی آئی۔ ہوا اس کے سنہرے بالوں سے اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔ شاہد نے کہا۔

"بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے"

"رونق کی باتوں میں دیر ہو گئی"

"اور یہاں جان پر بن گئی اتنی دیر میں"

"توبہ تم بھی باتیں خوب بناتے ہو تم"

"باتیں بناتا ہوں یا آئی بات بھول جاتا ہوں"

"ہم نے تو نہیں دیکھا کبھی"

"دیکھا تو بہت ہوگا یہ کہو محسوس نہیں کیا"

"اچھا بھئی یہی سہی۔ تم تو پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ آئی بات بھول جاتے ہیں۔ سچ کہتی ہوں۔ یہ مرد بھی آفت کے پرکالے ہوتے ہیں۔ توبہ الٰہی"

"یہاں جو گزر رہی ہے دل جانتا ہے"

؎
تم کو آشفتہ نصیبوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے

"خیر تو ہے کیا ہوا آپ کو؟"

"یہ سماج ہمارے راستے میں پہاڑ بن کر کھڑی ہو گئی ہے۔ بس سے ٹکرا کے کہیں ہم اپنا سر نہ پھوڑ لیں۔"

"کیا کیا سماج نے آپ کا؟"

"کیا نہیں کیا اس نے۔ یہی سماج ہے جس نے میری معصوم بہن کو طوائف کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہی سماج ہے جو ہمیں، ہماری محبت سمیت نگل جانا چاہتی ہے۔"

(گھبرا کر) "کیا بات ہوئی۔ ذرا کہئے نا۔"

"میں ایک بڑا خطرہ تمہارے گرد منڈلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اب تم جلد از جلد وہ گھر چھوڑ دو۔ جہاں رہ رہی ہو۔ منصور لاکھ تمہارا پشت پناہ ہی لیکن ....."

"آخر یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم"

"جب مجھ غیر پر اس وہاں سے باہر حملہ ہو سکتا ہے۔ تو تم ان کی اپنی ہو۔ اسی گھر میں رہتی ہو۔ وہاں تمہاری زندگی ختم کی جا سکتی ہے"

"کس نے حملہ کیا تم پر۔ کون تھا وہ۔ بتاؤ مجھے!"

شاہد نے سارا ماجرا ثریا کو دہرایا اور داور و گلشن کا سنایا۔ وہ سن رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ وفور تاثر سے اس کا خون منجمد ہو رہا ہے۔ شاہد نے کہا۔

"ان حالات میں تمہارا وہاں رہنا خطرناک ہے۔"

"تم میری فکر نہ کرو شاہد۔ میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ ان بزدلوں کی یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ مجھ پر وار کریں۔ منصور سے سب کا خون خشک ہوتا ہے لیکن تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا میں معاف نہیں کر سکتی۔ ابھی جا کر وہ قیامت اٹھاتی ہوں

کر تو اس درست ہو جائیں گے سب کے۔

"تم وہاں کا رہنا نہیں چھوڑو گی؟"

"کیوں چھوڑ دوں۔ میرا گھر ہے"

"میں تڑپتا رہوں گا یونہی؟"

"دیکھو اچھی باتیں۔ یہ دوسرا سوال پیدا کر دیا۔ جو عہد ہم کر چکے ہیں۔ اس پر قائم رہیں گے۔ جب تک ایم اے میں کامیاب نہ ہو جائیں اور اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہو کر جائیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ یہ میری شرط تھی۔ جسے تم منظور کر چکے ہو۔ مرد قول سے نہیں پھرا کرتے!"

"ابھی تو کئی مہینے ہیں۔"

"تم مرد ہو کر ہمت ہارے دیتے ہو۔ بڑی بات ہے شاہد! اس واقعہ کا ذکر اپنے گھر میں نہ کرنا۔

"کیوں نہ کروں؟"

"میرا مقصد تو یہ تھا۔ کہ تم چوکنی ہو جاؤ۔ گھر میں ایک نیا فتنہ کھڑا کرنے سے کیا فائدہ؟"

"خوب کہی۔ میں تو آج ایسے لتے لوں گی بھائی جان کے کہ وہ یاد کریں گے۔"

"نہیں بھئی کہنا مانو!"

"نہیں مانتے۔ کچھ زبردستی ہے؟"

شاہد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیب سے سگرٹ نکالی اور سلگانے لگا۔ اسے ثریا نے کہا۔

"ہاں یہ تو بتاؤ"

"کیا پوچھتی ہو؟"

"وہ تم سماج اور اپنی بہن کا کیا کہہ رہے تھے؟"

"وہ بھی ایک لمبی داستان ہے"

"میں تو سنوں گی"

(مسکرا کر) "میں کوئی داستان گو ہوں تمہارا؟"

"نہیں ہو تو بننا پڑے گا تمہیں"

"نہیں بنتے"

"میں تو بنا کے رہوں گی" یہ کہہ کر ثریا نے کتابوں کا بستہ سبزہ پر رکھا۔ اکڑوں بیٹھ کے دونوں ہاتھوں کے گھیرے میں اپنے دونوں زانو دبائے۔ پھر ذرا جھک کر اس نے اپنی ٹھوڑی زانو پر رکھی۔ اور کہنے لگی۔

"ہاں بھئی چلو"۔

ثریا کی یہ دھج دیکھ کر شاہد از خود رفتہ ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں اس کے چہرہ پر گاڑ دیں۔ وہ چند سکینڈ تک خاموش رہی۔ پھر شرما کے اس نے اپنی نشست بدل دی۔ کہنے لگی۔

"ارے واہ کیا ایکٹ کر رہے ہو یہاں؟"

شاہد چونکا۔ اس نے کہا۔ یہ وہ ایکٹ نہیں تھا۔ جو فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ یا اسٹیج پر جس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ وہ ایکٹ تھا......!"

"بس بس سن چکی۔ جان لیا بڑا اچھا ایکٹ تھا یہ۔ اب وہ بات سناؤ"

شاہد سنبھل بیٹھا۔ اس نے کہا۔

ثریا میں تمہیں وہ راز بتا رہا ہوں جو آج ہی میرے کانوں تک پہنچا ہے اور جب سے میں نے سنا ہے میرا خون کھول رہا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے خدا مجھے اتنی طاقت طاقت دے دے کہ میں اس سماج کو اسی طرح کچل دوں۔ پامال کر دوں جس طرح یہ غریبوں اور ناداروں مجبوروں اور بے لبوں کے دل کچلتی رہتی ہے۔ پامال کرتی رہتی ہے۔

توبہ اللہ۔ تقریر ہو رہی ہے اور اصل بات کیا ہے؟ اس کا کہیں دور نزدیک پتہ نہیں!

اب شاہد سنجیدہ ہو کر بیٹھ گیا اور جو کچھ اس نے زہرہ سے سنا تھا ایک حرف اس کا دہرا دیا۔ ثریا بت بنی یہ باتیں سنتی رہی۔ شاہد کی داستان سرائی ختم ہوئی تو اس نے کہا

"افوہ واقعی ہماری سماج کتنی بے درد ہے"

"صرف بے درد؟ قاتل، خونی، ہلاکو!"

"ہاں سچ تو"

"یہ سماج اس قابل ہے کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں اور ہوا میں اڑا دیئے جائیں۔ یہ معصوموں کو گناہگار بناتی ہے۔ پاک دامنوں کو آبرو فروشی پر مجبور کرتی ہے۔ نیکوں کو برائی کے راستہ پر لا ڈالتی ہے"۔

"بے شک، بالکل سچ۔ میں تو خود اس سماج کی دشمن ہوں ہمیشہ سے"

شاہد نے پھر سگرٹ سلگایا۔ ثریا بولی۔

"پہلے میں زہرہ کی اس لئے عزت کرتی تھی کہ وہ تمہاری بہن ہیں۔ لیکن میرے دل میں اب ان کی عظمت ہے۔ اسے کہتے ہیں کردار۔ یہ ہے کردار!"

"سچ کہہ رہی ہو ثریا!"

"بالکل سچ۔ جھوٹ کیوں بولوں گی۔ کیا وہ عورت ہر عزت اور عظمت کی مستحق نہیں ہے۔ جسے سماج نے ٹھکرا دیا ہو۔ جسے سماج نے نماز کے مصلے سے رنڈی کے کوٹھے پر پھینک دیا ہو۔ جو ناچتی ہو۔ گاتی ہو۔ لوگوں کے دل لبھاتی ہو۔ انہیں اپنے تیر نظر کا شکار بناتی ہو۔ لیکن جس کا دامن حور کی طرح آلودگی پاپ اور معصیت سے پاک ہو۔ زہرہ عورت نہیں ہے مجسم کردار ہے۔ وہ!"

شاہد بدستور سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ثریا نے کہا۔

کہتے ہیں پانی میں رہ کر کپڑوں کو تر بتر ہونے سے نہیں بچایا جا سکتا۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

لیکن زہرہ نے ثابت کر دیا۔ وہ کبر مواج میں رہ کر بھی اپنا دامن خشک رکھ سکتی ہے۔ جی چاہتا ہے اس عورت کے قدموں پر عقیدت کا سر رکھ دوں۔

شاہد کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے کہا۔

"ثریا تمہیں ان سے ملتے ہوئے عار نہ آئے گا؟"

"ہرگز نہیں"

مسکرا کر تو انٹرویو کا انتظام کردوں"۔

"انتظام کی کیا ضرورت ہے۔ لے چلو مجھے وہاں"۔

"نہیں ثریا وہاں نہیں۔ میں کل انہیں اپنے گھر پر بلاؤں گا۔ وہیں تھوڑی دیر کے لئے تم بھی آجاؤ۔ ذرا میرا نشیمن بھی دیکھ لینا۔ وہی نشیمن جہاں تمہاری محبت کا خزانہ بند ہے۔ لیکن جہاں آج تک تمہارے قدم نہیں گئے۔"

"ضرور آؤں گی۔ اچھا کس وقت؟"

"جس وقت تمہارا جی چاہے"

"کالج جانے سے پہلے؟"

"ہاں وقت ٹھیک رہے گا"۔

ثریا اور شاہد خوش خوش اٹھے اور اپنے اپنے نشیمن کی طرف چل دیئے۔

باب ۳۲

عورت

ثریا گھر واپس آئی۔ آتے ہی کمرے میں جا کر کتابیں رکھیں اور سیدھی چلی منصور کے کمرہ کی طرف۔ وہ زیادہ وقت منصور کے کمرہ میں صنوبر اور اس کے بچے کے ساتھ صرف کرتی تھی۔ صنوبر اور اس کے اور منصور کے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک ہو رہا تھا۔ گھر میں کوئی آدمی دق یا کسی اور متعدی مرض میں مبتلا ہو جائے۔ اس کے برتن الگ کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ کوئی کھانا نہیں کھاتا۔ اسی طرح ان تینوں کے برتن الگ تھے۔ کوئی ان سے نہ سیدھے منہ بات کرتا تھا نہ ان کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ قدرتاً ان تینوں میں پہلے سے کہیں زیادہ ارتباط اور خلوص پیدا ہو گیا تھا۔ یہ ایک دوسرے کے ہمراز، ہمدم اور ہمدرد تھے۔

ثریا نے جیسے ہی منصور کے کمرہ میں قدم رکھنا چاہا۔ اس نے سنا کوئی چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ وہ کبھی صنوبر اور منصور میں راز و نیاز ہو رہے۔ الٹے پاؤں

واپس چلی۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ وہ کمرہ کے اندر نہیں گئی۔ دروازہ کی اوٹ میں سے جھانکنے لگی۔ سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔

بچہ چارپائی پر لیٹا ہوا مسکرا کر چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صنوبر ایک بے خودی کے عالم میں اس پر جھکی ہوئی تھی۔ کبھی وہ اسے پیار کرنے لگتی تھی کبھی اس سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ کبھی اٹھاتی تھی اسے اور سینے سے لگا لیتی تھی۔ پھر لٹا دیتی تھی چارپائی پر۔ اس نے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

بالکل اپنے باپ پر پڑا ہے۔ دیکھو نا وہی بڑی بڑی آنکھیں وہی گورا گورا رنگ وہی شرارت ۔۔ ابھی سے سیکھ لی شرارت اس نے مسکرا رہا ہے مکار کہیں کا کیوں لے تو بھی بڑا ہو کر اپنے باپ کی طرح کسی لونڈی کو بیاہے گا ۔۔ نا بری بات دنیا ہنسے گی تجھ پر۔ ماں باپ نکال دیں گے تجھے گھر سے بائیکاٹ کر دیں گے تیرا
(گود میں اٹھا کر سینہ سے لگا کر) میں کیوں نکالنے لگی اپنے لال کو۔ اس کا باپ بھی ایسا نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو میری بانہہ پکڑ کر کیوں لے آتا۔ بھرے مجمع میں سے اپنے گھر میں وہ تو بڑا اچھا ہے اور تو ۔۔۔۔؟ (ہنس کر) شریر!

صنوبر اسی طرح باتیں کیے جا رہی تھی۔ اپنے بھول سے وہ ماں کی باتیں سنتے سنتے سو گیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس کی باتیں۔ بیاہ شادی ماں ۔ باپ ۔ گھر ۔ لونڈی ۔ یہ سب وہ اصطلاحیں تھیں جن سے ابھی تک وہ ناآشنا تھا۔ بیگانہ تھا۔

بچہ کو سوتا دیکھ کر وہ اسی چارپائی پہ پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ وہ سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہاں منصور کی قدم آدم تصویر آویزاں تھی۔ اس تصویر اس

Rekhta

نے نظر جمادی۔ اس کی آنکھوں سے اس وقت چاہ، پریم اور فدائیت کا سمندر ابل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی یہ آنکھیں ایک بڑا سا سمندر بن جائیں گی۔ اور اس تصویر کو مع اس کے فریم کے کچا چبا جائیں گی۔

کبھی اس کے چہرہ پر تصویر کو دیکھتے دیکھتے شرم کی سرخی دوڑ جاتی۔ شاید اسے وہ دن یاد آرہا ہوگا۔ ثریا سوچتی۔ جب حیا تے پہلے پہل اسے اپنایا تھا۔ کبھی اس کے چہرہ پر افسردگی کی سیاہی چھا جاتی۔ شاید وہ سوچ رہی ہوگی کہ اس محبت کا انجام کیا ہوگا۔ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ یہ ناؤ کس طرح پار لگے گی۔ کبھی اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا۔ شاید وہ سوچ رہی ہوگی کہ اس نے دنیا کی سب سے بڑی دولت منصور۔ بے سان گمان پالی اس سے بڑھ کر خوش رہنے کا حق کسے ہے؟

بڑی توجہ سے ثریا صنوبر کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اسے صنوبر کے چہرہ پر عورت کا دل حرکت کرتا، سورج کی طرح جگمگاتا۔ تاروں کی طرح جھلملاتا نظر آرہا تھا۔ اس کا دل سینہ سے باہر نکل آیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا دل نے اپنا ہر جذبہ صنوبر کے چہرہ پر بکھیر دیا ہے۔ وہ اس وقت باندی نہیں۔ منصور کی چہیتی نہیں۔ عورت نظر آرہی تھی۔ صرف عورت جو کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔ جو قدرت کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔ جو انسانیت کا سب سے بڑا —— کوہ نور سے بھی بڑا ہیرا ہے۔

ثریا کا جی چاہ رہا تھا وہ دوڑ کر کمرہ میں گھسی چلی جائے اور صنوبر کی گود میں سر رکھ دے اور اس سے کہے بہن! یہ جلال، یہ وقار جو اس وقت تیرے چہرے پر جگمگا رہا ہے۔ مجھے بھی دے دے۔ سب نہیں تھوڑا سا۔ اچھا تھوڑی دیر کے لئے ہی۔

ثریا سوچ رہی تھی عورت کی دو ہی حیثیتیں ہیں۔ ماں اور بیوی۔ باقی جو کچھ ہے۔

دکھاوا ہے تصنع ہے۔ اس چھوکری نے جسے گھر بھر ذلیل و حقیر سمجھتا ہے۔ جسے دیکھ کر گھر کے لوگ آگ بگولہ ہوئے جاتے ہیں۔ جس کا نام سن کر اس کی سی دوسری باندیاں کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتی ہیں —— ایک ہی زقند میں دونوں منزلیں طے کرلیں۔ یہ ماں بھی بن گئی۔ اور بیوی بھی —— اس سے بحث نہیں پہلے کیا بنی؟ لیکن یہ سچ ہے کہ اس نے سب کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ سب اس کا منہ تکتے رہ گئے۔ سب نے بڑھ بڑھ کر اس کے راستہ میں پتھر بچھا دئے۔ اس پر کنکریں پھینکیں۔ لیکن کوئی روک اس کے لئے روک نہ بن سکی۔ یہ جھاڑ جھنکاڑ پھول کانٹے۔ دریا۔ سمندر۔ پہاڑ۔ ٹیلے سب کو طے کرتی ہوئی سب کی دسترس سے باہر ہو گئی۔ عجیب عورت ہے یہ!

ثریا سوچ رہی تھی۔ نظر صنوبر پر جمائے ہوئے تھی۔ اور وہ بدستور منصور کی تصویر سے آنکھیں لڑا رہی تھی۔ دفعتہً ثریا چونک پڑی۔ اس نے سنا۔

"پکڑ لیا چور کو!"

"مگر چور [illegible] ہے۔" تو منصور سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

یہ سب کچھ دروازہ ہی کے پاس ہوا۔ چور کا نام سن کر اور منصور کی آواز پہچان کر صنوبر گھبرائی ہوئی جلدی سے باہر نکل آئی۔ چور بھی مسکرا رہا تھا۔ اور اسے پکڑنے والا سپاہی بھی۔ ان دونوں کو مسکراتا ہوا دیکھ کر صنوبر بھی مسکرانے لگی۔

باب ۳۵

ماں کا دِل

ثریا منصور کے ساتھ ساتھ کمرہ میں داخل ہوئی۔ دونوں ایک صوفے پر پاس پاس بیٹھ گئے۔

"ہاں بھئی کیا حال چال ہے۔ کئی دن سے تم سے باتیں نہیں ہوئیں"

"کچھ سنائیے آپ ادھر ادھر کی۔"

"شاہد سے ملاقات ہوئی"

(گردن جھکا کر) جی ہاں!

"خیریت؟"

"ان کی تو جان لینے کی تدبیریں ہونے لگی ہیں اب؟"

"ایں؟ جان لینے کی؟ کیا ہوا؟"

ثریا نے انور اور شاہد کی معرکہ آرائی۔ یاسمین کی سازش اور گلشن کی فریب کاری

کا ایک ایک واقعہ سنا دیا۔

منصور نے کہا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بھائی جان ایسی حرکتیں بھی کر سکتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم فیصلہ کرلیں۔ انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہمارے حصّے کے متولی بنے رہیں اور ہمیں نیچا دکھانے کی تدبیریں ہمارے ہی سرمایہ سے کرتے رہیں۔

"ٹھیک ہے بھیا"

"میں ابھی جاتا ہوں ان کے پاس تم بھی چلو!"

"چلیے"

دونوں بہن بھائی ساتھ ساتھ نیچے پہنچے۔ شاکر بھی ابھی باہر سے آیا تھا۔ بیٹھا ہوا حقّہ پی رہا تھا۔ امی جان بھی پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھی تھیں۔

یہ دونوں تو دو اور بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شاکر نے نظر اونچی کی۔ دیکھا اور پھر حقّہ پینے لگا۔ امی جان نے ان دونوں کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا۔

کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر منصور نے کہا۔

"میں کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں"

"مجھے فرصت نہیں ہے"

"لیکن یہ باتیں تو آپ کو سننی ہی پڑیں گی"

"میں نہیں سنتا۔ جاؤ اپنا کام کرو"

"اپنے کام ہی کے سلسلہ میں آیا ہوں یہاں"

"کیا کام ہے آپ کا؟ فرمائیے؟"

میرا اور ثریا کا حصّہ الگ کر دیجئے۔ مکان۔ جائیداد۔ اسباب منقولہ جو کچھ

ہے۔ اسے تقسیم کیجیے۔ آپ اپنا اور امی جان کا شرعی حصہ لے لیجیے۔ میرا اور ثریا کا حصہ دے دیجیے۔"

"بڑا آیا کہیں کا شرع پر چلنے والا۔ اب تک گھر میں حرامکاری ہو رہی ہے۔ نکاح تو کیا نہیں بدمعاش نے۔ اور چلا ہے شرع بگھارنے؟"

حرامکاری کا الزام غلط ہے۔ بیشک شروع شروع میں میرے اور صنوبر کے تعلقات آپ لوگوں کی اصطلاح میں ناجائز تھے۔ لیکن وہ اس وقت بھی مجھے اپنا شوہر سمجھتی تھی اور میں اسے اپنی بیوی سمجھتا تھا۔ پھر بعد میں اس نے نکاح پر اصرار کیا۔ تو میں نے نکاح بھی کر لیا۔

"اے چل ہٹ۔ تو کیا اور تیرا نکاح کیا؟"

"خیر اس بحث کو چھوڑیے۔"

"کیوں چھوڑیں اس بحث کو۔ تو ہمارا باوا ہے۔ جو ہمارا جی چاہے گا کہیں گے۔"

"بہتر ہے کہیے جو آپ کا جی چاہے۔ لیکن تقسیم کے بارے میں کیا سوچا آپ نے؟"

"میں نے عاق کیا تجھے بھی اور ثریا کو بھی۔ ایک حبہ تو دوں گی نہیں تجھے!"

"آپ نے عاق کر دیا تو اپنی جائیداد سے محروم کر دیجیے ہم دونوں کو۔ لیکن میں اور ثریا اپنے مرحوم باپ کی جائیداد میں تو اپنا حصہ رکھتے ہیں۔ اسی کا مطالبہ ہے اس وقت ورنہ مفت میں بات بڑھ جائے گی۔"

"اور سنو بات بڑھ جائے گی۔ موا کل کا چھوکرا آیا ہے۔ کٹنی کو (ثریا کی طرف اشارہ کر کے) ساتھ لے کر دھمکانے۔ کیا کرے گا تو؟"

"مقدمہ دائر کروں گا"

"یہ ارمان بھی ہے۔"

"ارمان تو نہیں ہے۔ لیکن جب سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا۔ تو انہیں ٹیڑھا کرنا ہی پڑے گا۔"

"جو تیرا جی چاہ رہا ہے تو کر رہا ہے۔ جو تیری بہن نے چاہا وہ کیا خصم تک کر لائیں اپنی پسند۔ موا نیچ! اسی گھر میں رہ کر ہمارے سینے پر کودوں دل رہے ہو تم دونوں اب یہ کسر رہ گئی ہے کہ بی بی ثریا ٹھکنی ہو جائیں۔ اور لفنگی ہوتی شاہد کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ سو جس دن ان کا جی چاہے گا یہ بھی کر لیں گی۔ وہ پھر آخر جائیداد تقسیم کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"اس کی بھی وجہ ہے"

"میں بھی تو سنوں"

"اب بھائی جان ایسی حرکتوں پر اتر آئے ہیں کہ ہم دونوں کا ان کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا۔"

"آخر کیوں؟"

انہوں نے یاسمین کے بھائی انور جیسے بدمعاش کو یہ لالچ دے کر کہ ثریا کو اس کے ساتھ بیاہ دیں گے۔ اسے آمادہ کیا کہ وہ شاہد کو مار ڈالے یا کم از کم اسے چھرا دکھا کر طلاق نامہ پر دستخط لے لے۔ ان حرکتوں کو میں برداشت کر سکتا ہوں؟ ثریا معاف کر سکتی ہے؟"

"(شاکر کی طرف دیکھ کر) سن رہے ہو شاکر۔ کیا کہہ رہا ہے یہ؟"

"سن رہا ہوں۔ بکتا ہے!"

"میرے پاس ثبوت ہے"۔

"کیا ثبوت ہے؟"

وہ بیان جس پر انور کے دستخط ہیں۔ جس میں اس نے ان سب باتوں کا جو ابھی میں نے کہیں، اعتراف ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو اسے عدالت میں بھی پیش کرونگا۔

یہ بات انور نے شاکر کو نہیں بتائی تھی۔ وہ مصلحتاً اسے گول کر گیا تھا منصور سے یہ انکشاف سن کر شاکر کا چہرہ اتر گیا۔ اس کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

اب امی جان کا غصہ بھی دھیما ہوا۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں اس کا انہیں وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

منصور نے کہا۔

"بھائی جان، میں ایک مہینہ کی مہلت دیتا ہوں آپ کو اس عرصہ میں آپ خود ہم دونوں کا پورا پورا حصہ خواہ زر نقد ہو۔ اسباب منقولہ ہو۔ جائیداد ہو۔ منقولہ الگ کر دیجئے اور امی جان کے حصہ پر تیز امی جان کی جائیداد پر آپ شوق سے قابض اور متصرف رہئے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر آپ نے ایک مہینہ کے اندر ہمارے حصے الگ نہ کر دیئے۔ تو میں اپنی اور ثریا کی طرف سے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہوں گا۔ اپنے حصہ کے ساتھ ساتھ میں حساب فہمی کا دعویٰ بھی کرونگا۔ اور ابا جان کی وفات سے لے کر اس وقت تک کا سب حساب آپ کو دینا پڑے گا۔ البتہ اگر آپ نے خود ہمارے حصے الگ کر دیئے تو ہم حساب فہمی کے مطالبہ سے دست بردار ہو جائیں گے"

"لے لینا اپنا حصہ کون اسے دبائے رکھنا چاہتا ہے بھئی!"

شکریہ آپ کا

"امی جان پھر بولیں۔ لے تو تم لوگ اپنے حصے۔ لیکن ایک بات بتائے دیتی ہوں سن لو کان کھول کے"

فرمایئے۔ منصور نے کہا۔

"چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ میں شاہد کو تو اس گھر میں نہیں گھسنے دوں گی سر پھوڑ کر مر جاؤں گی۔ بی ثریا اس کے ساتھ عیش کریں شوق سے رہیں جہاں جی چاہے۔ اس کے ساتھ جا کر لیکن اس گھر میں وہ نہیں آسکتا"

امی جان یہ ظلم ہے آپ کا۔ منصور نے کہا۔

ظلم سہی۔ تو نے تو ڈنڈی بجھالی۔ میں چپ ہو گئی۔ اس نے شاہد سے آنکھیں لڑائیں اور اس سے بیاہ تک رچا بیٹھی۔ میں کچھ نہیں بولی۔ کم بخت تمہاری مت ماری گئی ہے ماں کی خاطر بھی کوئی چیز نہیں ہے تمہاری نگاہ میں؟ میں اس کی صورت نہیں دیکھوں گی۔ وہ موا اگر میرے سامنے آگیا تو اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اس کا اور ثریا کا گلا گھونٹ دوں گی پھر خود بھی زہر کھا لوں گی۔

یہ کہہ کر امی جان بلک بلک کر بچوں کی طرح رونے لگیں۔ منصور کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ثریا کی آنکھوں سے بھی موتیوں کے قطرے ٹپکنے لگے۔

منصور اس معاملے پر مفاہمت کے لئے کوئی نیا فارمولا پیش کرنے والا تھا کہ ثریا کھڑی ہو گئی۔ اس نے کہا۔

اماں! میں تمہیں روتا نہیں دیکھ سکتی۔ تمہارے سکھ کے لئے میں اپنی زندگی بھی قربان کر دوں گی۔ تم نے اپنا نام لے کر مجھے منع کیا ہوتا۔ تو میں شاہد کو ٹھوکر مار دیتی۔

جیسا منصور کا گلا گھونٹ دیتی۔ صنوبر کو زہر پلا دیتی اور اس معصوم بچہ کی ٹانگ کر پٹک دیتی۔

تم تو سماج۔ رسم۔ خاندان ناک کو بیچ میں لانے لگیں۔ میں ان سے جلتی ہوں۔ ان کے آگے سر نہیں جھکا سکتی۔ لیکن اپنی ماں کے لئے میں دنیا کی ہر چیز حتّٰی کہ اپنے ارمان اور آرزو بھی قربان کر سکتی ہوں!

تم اگر شاہد کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی ہو۔ تو میں تمہیں اطمینان دلاتی ہوں میں بھی آج سے اس کی صورت نہیں دیکھوں گی۔ میں اس سے نفرت کرنے لگوں گی۔ اور اگر پھر بھی اس کی محبت میرے دل سے نہ نکلی۔ تو ایک چھری لے کر سینہ میں بھونک دوں گی۔ تمہاری بوڑھی لیکن اپنی نظروں میں دنیا جہان سے پیاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی۔ ان آنسوؤں کو روکنے کے لئے میں اپنا خون بہا دوں گی۔ اور اپنی آرزوؤں کا خون کر دوں گی۔

تم مجھ سے خفا ہو۔ مجھے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ میرا جی چاہتا ہے۔ پھر جھک کر تمہاری گود میں بیٹھ جاؤں۔ تم سے ضدیں کروں۔ تمہاری آغوش میں بیٹھ کر تمہاری باتیں ماننے سے انکار کروں۔ تم پیار کرو۔ میں روٹھ جاؤں۔ میں تمہارے گلے میں باہیں ڈال دوں۔ تم مجھے کہانی سناؤ۔ میں سنتے سنتے سو جاؤں۔ لیکن اب تم میری ماں نہیں رہیں بدل گئیں۔ مجھے دیکھ کر تم نفرت سے منہ پھیر لیتی ہو۔ میرا جی چاہتا ہے۔ تمہارے سر میں تیل ڈالوں۔ کنگھی کروں۔ جیسے کرتی رہتی تھی۔ لیکن نہیں دیکھ کر میرا حوصلہ نہیں پڑتا۔ میں سہم جاتی ہوں۔ وہ ماں جو میرے اوپر جان چھڑکتی تھی۔ وہ مجھ سے پھر گئی۔ روٹھ گئی۔ میری دشمن بن گئی۔ اس زندگی سے موت مجھے اچھی لگتی ہے۔ وہ تم سے اچھی ہے۔ تم روٹھیں تو مجھ سے دور ہو گئیں۔ اب میں تمہیں نہیں پا سکتی۔ لیکن اسے ہر وقت بلا سکتی ہوں۔ وہی میرے دل کو سکون دے گی۔

یہ کہتے کہتے ثریا بے اختیار رونے لگی۔

امی جان کی آنکھوں سے بھی گنگا جمنا کی تراوش ہو رہی تھی۔ وہ اٹھیں اور ثریا کو پکڑ کر اپنے سینہ سے لگا لیا۔ وہ بھی رو رہی تھیں اور ثریا بھی۔ دونوں ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی تھیں۔ منصور بہت ضبط کر رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھرے ہوئے تھے۔ شاکر کے منہ میں حقہ کی نے تھی۔ اس نے یہ منظر دیکھا۔ اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

امی جان اپنے ساتھ ثریا کو اپنے کمرہ میں لے گئیں۔ اسے خوب پیار کیا۔ کہنے لگیں۔

"میرا چاند"

یہ کہتے ہی ان کے بوڑھے اور بے بس ہونٹ تھر تھرانے لگے۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

ثریا بھی رونے لگی۔

امی جان نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! میں کچھ نہیں کہتی۔ تو نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ لیکن اپنے دل کو کیا کروں۔ سوچتی ہوں۔ میرا داماد ہے وہ تو خون کھولنے لگتا ہے؟"

"کیوں، ماں؟"

"ہمارا اس کا جوڑ کیا۔ وہ طوائف زادہ تو شریف زادی"

"ماں! یہ بات نہیں ہے"

یہ کہہ کر اس نے وہ ساری داستان جو شاہد سے سنی تھی۔ ان کے سامنے دہرا

دی — وہ سنتی جاتی تھیں۔ اور ان کے چہرہ کے نکھار کو خوشی کا غازہ بڑھاتا جاتا تھا۔

وہ بہت خوش ہوئیں۔ کہنے لگیں۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اب۔"

"اور اماں منصور بھیا"

"اس کا نام نہ لینا میرے سامنے"

گلے میں باہیں ڈال کر "میری اماں نہیں"

"اس نے میرا دل بہت دکھایا ہے۔ زبان تو دیکھو کیسی پٹر پٹر چلتی ہے۔"

"خوش ہو جاؤ میری اماں!"

اتنے میں منصور ادھر سے گذرا۔ اس نے میل ملاپ کا یہ رنگ جو دیکھا تو کھڑا ہو گیا۔ اور ثریا کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا۔ امی جان گردن جھکائے میٹھی بیٹھی تھیں۔ ثریا نے اشارے سے بلایا۔ وہ آتے ہی لپٹ گیا امی ان سے۔

"چلو ہٹو۔ بس زیادہ چونچلا نہ دکھاؤ۔"

یہ کہہ کر انہوں نے گردن اٹھائی۔ تو منصور آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ یہاں یہ ہو رہا تھا۔ ثریا نے جانے کیا سوچا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھی۔ دھم دھم کرتی اوپر گئی۔ اور بچہ کو لا کر امی جان کی گود میں ڈال دیا۔ بالکل ہو بہو منصور کا نقشہ تھا۔ وہ ان کی گود میں آتے ہی مسکرانے اور کلکاریاں مارنے لگا۔ انہوں نے گود میں لے کر اس کی پیشانی چومی۔ اور ثریا کے ہاتھ

میں دے دیا۔ کہنے لگیں۔ پہلے پیشاب کرا لاؤ۔ مرے بے نماز کے کپڑے بھی خراب کر دے گا یہ!

باب ۳۶

زہرہ اور ثریا کی ملاقات

صبح ہوئی۔ حسب وعدہ ثریا شاہد کے مکان پر پہنچ گئی۔ شاہد نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ کہنے لگا۔ آیئے تشریف لائیے۔ زہے قسمت!

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ثریا مسکرائی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی زہرہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ثریا نے پوچھا

"آئیں نہیں وہ اب تک؟"

"آجائیں گی وہ بھی۔ مجھے تمہارے آنے سے جو خوشی ہوئی ہے۔ وہ ان کے آنے سے تھوڑی ہوگی۔"

"بری بات۔ یہ نہ کہو!"

"بری بات نہیں۔ سچی بات۔ واقعہ بھی ہے!"

بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جو سچ ہوتی ہیں۔ لیکن انہیں زبان سے نہیں نکالا کرتے۔"

"وہ کوئی اور لوگ ہوتے ہوں گے۔"

"اگر وہ سن لیں تو؟"

"تو کیا ہوگا؟"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ زہرہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے کرہ میں آتے ہی دونوں کھڑے ہو گئے۔ بڑے پیار سے اس نے ثریا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کہنے لگی۔

بیٹھ جاؤ بیٹی!

"جی ہاں بیٹھتی ہوں۔ آپ تشریف رکھیے"

سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ زہرہ نے کہا۔

"تمہارے ملنے کو دل تڑپ رہا تھا۔ ہمت نہیں پڑتی تھی ملنے کی۔ کوئی صورت نہیں نظر آتی تھی۔ شکر خدا کا میری آرزو پوری ہوئی۔"

"یہ نہ کہیئے! میں خود آپ سے ملنے کے لئے بے تاب تھی۔ مجھے فخر ہے کہ میں آپ سے مل رہی ہوں۔ آپ جیسی عورتیں تو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں!"

"اوہو۔ ہماری ثریا بیگم بنانے لگیں ہمیں!"

میں بناتی نہیں آپ کو کیا بناؤں گی۔ شاہد سے آپ کے جو واقعات معلوم ہوئے انہوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اللہ اللہ دنیا میں ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔

زہرہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے کہا۔ ثریا تمہاری باتیں بڑی میٹھی ہیں۔ میں نے اپنے خیال کی دنیا میں تمہیں جیسا سمجھ رکھا تھا۔ تم اس سے بھی بڑھ کر

rekhta

نکلیں — میں تو خیر کس شمار میں ہوں۔ لیکن شاہد کو بے اختیار مبارک باد دینے کو جی چاہتا ہے کہ ایسا آب دار موتی اسے مل گیا۔

کچھ دیر تک ان تینوں میں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر زہرہ نے کہا۔

"مجھے دُکھ جو کچھ ہے وہ اس کا کہ تم نے شاہد کو پاکر بہنوں کو ماں جیسی نعمت تک کو کھو دیا۔"

"ہاں یہ تو میں کہنا بھول ہی گئی۔"

ثریا نے کہا

"کیا کوئی نئی بات ہے" ؟ شاہد نے پوچھا۔

"اماں مجھ سے خوش ہو گئیں۔ انہوں نے میری خطا معاف کر دی۔ اب وہ اس رشتہ پر معترض نہیں ہیں۔"

زہرہ نے بڑی خوشی کے ساتھ دریافت کیا۔

"سچ ؟ کیسے ؟"

ثریا نے سارا واقعہ من وعن بیان کر دیا۔ بڑی توجہ اور دلچسپی سے شاہد اور زہرہ سنتے رہے۔

شاہد نے کہا۔

"بس پھر کیا بات ہے۔ مار لیا پالا۔"

"یہ نہ کہو شاہد۔" ثریا بولی۔

"کیوں اب کیا خطرہ ہے ؟"

"تم بھائی جان کی افتادِ مزاج سے واقف نہیں ہو۔ وہ ابھی تک برہم ہیں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ خوش بھی نہیں ہونگے۔ ان کی یہ عادت ہے کہ جھاڑ کا کانٹا بن کر پیچھے پڑتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ نچلے نہیں بیٹھیں گے اور جو کچھ وہ کر سکیں گے ضرور کریں گے۔ شاید وہ ہار مان بھی لیتے۔ لیکن یہ بس کی گانٹھ یاسمین اس طرح انہیں نچاتی رہتی ہے۔ جیسے مداری بندر کو نچاتا رہتا ہے اور اسے خدا واسطے کی ضد پڑ جاتی ہے ہم لوگوں سے۔"

زہرہ نے بھی ثریا کے خیال کی تائید کی۔ اس نے کہا "ثریا کی بات ٹھیک ہے۔ شاکر صاحب کے مزاج سے میں بھی خوب واقف ہوں۔ ان سے ڈرنا چاہیئے۔ وہ جو کچھ بھی نہ کر گزریں کم ہے۔"

زہرہ اور ثریا کی یہ باتیں سن کر شاہد کا وہ چہرہ جو وفورِ مسرت سے کھل کھلا اٹھا تھا۔ افسردہ سا ہو گیا۔ اس کی یہ کیفیت ثریا نے بھانپ لی۔ اس نے کہا۔

"لیکن امی جان اب بھائی جان کے زہر کے تریاق بن جائیں گی۔ ان کے ہموار ہو جانے سے بہت بڑی مصیبت ٹل گئی۔ بھائی جان اب بھی ہمیں زک دینے کی کوشش کریں گے۔ لیکن امی جان سپر کا کام دیں گی۔"

ماں کا دل بھی کیا چیز ہے! زہرہ بولی۔

"بے شک۔ دنیا کی ہر محبت اپنے اندر غرض کا کوئی نہ کوئی پہلو رکھتی ہے۔ لیکن ماں کی محبت صرف محبت ہے۔ بالکل غیر مشروط۔"

"غیر مشروط" کے لفظ پر شاہد ہنس پڑا۔

ثریا نے کہا۔

امی جان نے ہمیشہ میرا مان رکھا۔ میری ہر ضد پوری کی۔ میری کوئی خواہش رد نہیں کی۔ بس زندگی میں پہلی اور شاید آخری دفعہ ایک معاملہ تھا جس میں انہوں نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن اب جب سے خوش ہوئی ہوں۔ پھر وہی اماں بن گئی ہیں۔ جو پہلے تھیں۔

شاہد نے کہا۔

"منصور سے انہیں خوش کروا دو تو جانیں"

"یہ بھی ہو چکا"

"واقعی"؟

"کہہ جو رہی ہوں میں"

"خوش ہو گئیں وہ منصور سے"؟

"بھلا میری ضد نہ پوری کرتیں۔ صرف خوش نہیں ہوئیں گلے سے بھی لگایا بچہ کو گود میں لئے لئے پھریں"!

"واہ بھئی۔ واقعی کمال ہو گیا" اور صنوبر؟

"ابھی اس کی صورت دیکھنے کو تیار نہیں ہیں"۔

"اس بیچاری کی کیا خطا ہے"۔

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔ لیکن ان کے دل پر یہ بات جم گئی ہے کہ اس نالزادی نے میرے بھولے بھالے لڑکے پر ڈورے ڈالے اور اسے ورغلا لیا"۔

شاہد اور زہرہ دونوں ہنسنے لگے۔ ثریا نے کہا۔

صنوبر سے بھی انہیں خوش کر کے رہوں گی۔ لیکن ابھی نہیں۔ ہم دونوں

کے جگر کے ٹکڑے تھے۔ بس جوش مادری میں انہوں نے معاف کر دیا۔ ثریا کو وہ ایک لونڈی سمجھ رہی ہیں ابھی تھوڑے کے فوراً وہ اسے بہو بناتے ہوئے جھجکتی ہیں، اور یہ ہے بھی فطری بات پرانے خیالات رفتہ رفتہ بدلتے ہیں!"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"لیکن میں انہیں لے آؤں گی راہ پر دیکھ لینا!"

"ہاں بھئی سچ ہے۔"

"راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل کھیلیں گے دو چار ملاقاتوں میں"

یہ کہہ کر شاہد نے ایک قہقہہ لگایا، زہرہ بگڑی، بڑے بدتمیز ہو تم اور بھی کسی پر نہیں ان پر شعر بازی کرنے لگے۔ نالائق کہیں کے۔

شاہد نے کہا۔ سیدھا سادھا بالکل میری طرح، تو یہ شعر ہے، اس میں بُری بات کیا ہے بقول ثریا کے وہ راہ پر آ ہی جائیں گی اور ایک روز صنوبر کا گناہ بھی بخش دیں گی ماں جو ٹھہریں۔ یاد رکھو ماں اسی بچے سے زیادہ محبت کرتی ہے جو زیادہ نالائق ہو، جو بچہ جتنا زیادہ شریر اور شیطان ہو گا اتنا ہی زیادہ ماں کا دلارا اور لاڈلا ہو گا!

زہرہ بولی۔ اگر قدرت تمہیں ماں بنا دیتی۔ تو تم ماں کا پارٹ بڑی اچھی طرح ادا کرتے۔

شاہد تو خاموش رہا۔ ثریا ہنس پڑی زور سے

باب ۳۷

آخری کوشش

امی جان نے ثریا کو کلیجے سے لگایا۔ منصور سے خوش ہو گئیں۔ لیکن شاکر نے ہر دو میں سے کسی کو معاف نہیں کیا تھا۔ وہ حالات سے مجبور تھا۔ اس لئے خاموش تھا۔ وہ دونوں کو غلط کار سمجھ رہا تھا۔ دونوں کی زندگی کا رُخ بدل دینا چاہتا تھا۔

وہ خوب سمجھتا تھا۔ اگر منصور کو یونہی آزاد چھوڑ دیا گیا اور صنوبر کے ساتھ اس کی شادی گوارا کر لی گئی۔ اگر ثریا کے معاملے میں مداخلت نہ کی گئی۔ اور اسے شاہد کے حبالۂ عقد میں چلا جانے دیا گیا۔ اس کا تو صرف ایک ہی انجام ہوگا۔ جائداد اور ہر آبائی چیز کے حصے بخرے ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اس کا کھلا ہوا ہاتھ بندھ جائے گا۔ اس کا اقتدار کم ہو جائے گا۔ اس کی آمدنی کم ہو جائے گی۔ اسی لئے وہ بار بار چاہتا تھا کہ صنوبر اور شاہد کو بیچ سے ہٹا دے۔ منصور و ثریا کو سماج کے جال میں پورے جکڑ دے۔ لیکن کس طرح؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

منصور کے الٹی میٹم نے اسے اور زیادہ حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ منصور جو کہتا ہے وہی کرتا ہے۔ اس نے ایک مہینہ کا الٹی میٹم دیا ہے۔ دو مہینے صبر کرے گا۔ تین مہینہ سہی۔ لیکن وہ اپنی اور ثریا کی جائداد الگ کرا کے رہے گا۔ امی جان اگر میرے ساتھ رہتیں تو شاید یہ دونوں کچھ تامل بھی کرتے۔ لیکن بدمعاشوں نے ان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب وہ امی جان کی سرپرستی میں ہیں۔ اب تو یہ اپنی من مانی کر کے رہیں گے۔

آخر وہ بڑے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا۔ کہ کوثر اور اختر کو بلوائے اور انہیں اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کرے۔

شاکر کی سوتیلی پھوپھی روشنک بیگم۔ کوثر ان کی لڑکی اور اختر ان کا لڑکا تھا۔ شاکر کے باپ اور روشنک بیگم میں کبھی نہیں بنی۔ پھر بھی ان کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ کوثر منصور کی دلہن بنے۔ اور اختر ثریا کو بیاہ لائے۔ وہ آگرہ میں رہتی تھی۔ شاکر نے خود وہاں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اپنے راز دار مختصر ملازم شکور کو وہاں بھیجا۔ وہ شاکر کا خط لے کر سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ اور ایک ہی سانس میں سارا خط سنا دیا۔

خط میں صنوبر اور شاہد کا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کرنے کے بعد شاکر نے لکھا تھا۔ میری دیرینہ آرزو یہی تھی کہ ثریا آپ کی بہو بنے۔ اور منصور آپ کا داماد۔ دونوں نالائق نکلے۔ امی جان کی جاہلانہ محبت نے انہیں اور بگاڑ دیا۔ ثریا کی ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی ہے۔ صنوبر ہر وقت دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کی جا سکتی ہے۔ میری طرح اگر آپ کی بھی یہی خواہش ہے تو دیر نہ کیجئے۔ کھانا وہاں کھائیے۔ پانی یہاں پیجئے۔ لیکن یہ سوچ لیجئے۔ آپ کوثر کو اور اختر کو ساتھ رکھ کر رکھئے اور احتیاطاً یہ یہاں رہنا ہوگا۔ ہرگز کسی پر یہ ظاہر نہ ہو کہ آپ میری بلائی ہوئی آئی ہیں۔ ہرگز ثریا اور صنوبر کو

ان کی غلطی پر نہ ٹوکئے بلکہ مبارک باد دیجئے۔ کہ تم نے جو کچھ کیا۔ تم جیسے باحوصلہ نوجوانوں کو یہی کرنا چاہیئے تھا۔

اب آپ کا کام ختم ہو جائے گا۔ کوثر اور اختر کا کام شروع ہوگا۔ کوثر جس طرح بھی ہو منصور کو بہلائے اور اپنا بنالے۔ اختر کسی طرح بھی ثریا سے راہ و رسم بڑھائے۔ اور اس کے دل پر قبضہ کر لے۔ دونوں ماشاءاللہ خوبصورت ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ مجھے امید ہے ضرور کامیاب ہوں گے اور صنوبر اور شاہد کو بے دخل کر دیں گے۔

پھر منصور آپ کا ہو جائے گا۔ ثریا آپ کی ہو جائے گی۔ آپ کے مرحوم بھائی کی عزت برباد ہونے سے بچ جائے گی۔ کیا آپ اپنے بھائی کی جائداد کو غیروں کے ہاتھ میں جانے سے بچانے کے لئے اپنے منصور اور ثریا کو ایک بدمعاش مرد اور ایک آوارہ چھوکری کے دام سے محفوظ رکھنے کے لئے کچھ نہیں کریں گی؟

میں نے یہ سب کچھ اس لئے لکھ دیا۔ کہ آپ بعد میں نہ کہیں کہ آپ کو خبر کیوں نہیں کی گئی۔ میں نے خبر کر دی۔ آگے آپ جانیں اور آپ کا کام!

روشنک بیگم نے بڑے غور سے خط سنا۔ کوثر بھی وہیں بیٹھی ہوئی خط سن رہی تھی۔ فوراً وہ بے ترتیب مجمع ایک اہم کانفرنس کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ اس تثلیث کا ہر رکن بحث و مباحثہ میں پورا حصہ لے رہا تھا۔ آخر طے پایا۔ کہ فوراً بستر باندھ لیا جائے۔

روشنک بیگم روتی ہوئی گھر میں داخل ہوئیں۔ بہت دنوں کے بعد یہاں آئی تھیں۔ گھر کے ذرہ ذرہ پر۔ در و دیوار پر مرحوم بھائی کی تصویر انہیں جلوہ گر نظر آئی تھی۔ اور وہ فوراً منہ لبسور لبسور کر رونے لگتی تھیں۔ گھر کے بعض اور لوگ بھی اخلاقاً رونے میں ان کا ساتھ دیتے تھے۔ ثریا سے وہ اس محبت سے ملیں۔ گویا کوثر ان کی سوتیلی لڑکی ہے

اور سہاگ کا ٹیکہ ثریا ہی کا ہے!

اسی طرح وہ منصور کے سامنے اختر کو خاطر میں بھی نہیں لاتی تھیں۔

وہ شاکر سے کچھ کچھ کھچی سی رہتی تھیں۔ یہی تو تھا وہ شخص جو ان کے منصور اور ثریا کی خوشی ایک آنکھ نہ دیکھ سکا۔ چلو کر لی شادی منصور نے صنوبر سے پھر؟ کیا ہو گیا؟ اتنا طوفان مچانے کی کیا ضرورت تھی، ثریا بھی پڑھی لکھی ہے۔ اس نے بھی ایک آدمی کو بنا لیا اپنا رفیق زندگی۔ کچھ بھاگ تو نہیں گئی کسی کے ساتھ۔ لے دے کے میری ثریا دوبارہ کیوں ایسی ہوتی۔

وہ صنوبر سے بھی کھل کر ملتی تھی، جیتی بیٹی کہتے ان کی زبان سوکھتی تھی۔ جب اس کے پاس بیٹھتی تو بچے کو کھلا رہی ہیں۔ شاہد کے دیکھنے کا اور بلائیں لینے کا بھی انہیں بے حد اشتیاق تھا، وہ شاکر کو سنا سنا کر بار بار کہہ چکی تھیں۔ شرافت خاندان سے نہیں ہوتی کرموں سے ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تو پیغمبر زادہ تھا لیکن کیا حشر ہوا اس کا اور حضرت ——— اصحاب کہف کے کتے کیا سے کیا بن گئے!

اپنے اس طرز عمل سے چند ہی روز میں روشنک بیگم نے وہ قبول عام حاصل کر لیا کہ امی جان تک ان پر رشک کرنے لگیں۔ ثریا کا زیادہ وقت انہی کے ساتھ صرف ہوتا تھا۔ منصور ان کا احترام کسی طرح اماں سے کم نہ کرتا تھا۔ صنوبر تو انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتی۔ رفتہ رفتہ ان باغیوں کی، وہ محرم راز اور پرائیویٹ سیکرٹری بن گئیں منصور اور ثریا جان چھڑکتے تھے اپنی پھوپھی جان پر۔

امی جان کو ان سے پرانی کدورت تھی۔ شوہر کی زندگی میں انہوں نے کبھی روشنک بیگم کو منہ نہیں لگایا۔ شروع شروع میں تو وہ اپنے تئیں لئے دئے رہیں۔ لیکن جب انہوں نے

دیکھا کہ اس دفعہ روشنک بیگم بالکل بدل گئی ہیں، بھائی کی موت نے ان کے سینہ پر کینہ کو ایک صاف شفاف آئینہ بنا دیا ہے، ان کی اولاد پر وہ صدقے قربان ہو رہی ہیں تو ان کا دل بھی صاف ہو گیا اب وہ بھی بہت تپاک اور محبت سے ملتی تھیں ان سے۔

کوثر اور ثریا، اختر اور منصور دونوں تقریباً ہم عمر تھے، بڑی بے تکلفی اور یارانہ تھا، آپس میں، رات رات بھر کوثر اور ثریا باتیں ہوا کرتیں دن دن بھر منصور اور اختر میں گاڑھی چھنا کرتی، ایک جان دو قالب بن گئے تھے یہ سب منصور کو اختر کے بغیر سیر و تفریح میں لطف نہ آتا، ثریا کوثر کے بغیر دانہ توڑتی۔

ایک روز باتوں باتوں میں اختر نے منصور سے کہا۔

"یار تم منوبر کی کس چیز پر ریجھ گئے؟"

"جوانی پر۔"

"تو وہی ایک جوان ہے ساری دنیا میں؟"

"میری نظر میں وہی ہے۔"

"نہ رنگ نہ صورت، بد ذوق کہیں کے۔"

"اختر ایک میک اپ وہ ہوتا ہے جو اسٹیج اور فلم کے ایکٹر اور ایکٹرس کرتے ہیں۔ لیکن ایک میک اپ ہوتا ہے قدرت کا، اور وہ جوانی ہے جوانی بہترین میک اپ ہے، بڑھاپا اس میک اپ کا اتار ہے۔ بڑھاپے میں خوبصورت اور بدصورت یکساں ہو جاتے ہیں۔"

"خوب ہے یہ نظریہ آپ کا۔"

"میرا نظریہ تو یہی ہے منوبر کی جوانی میری نظروں میں تھی۔ میں دیوانہ ہو گیا۔ اس کے سیاہ تاب چہرے پر جب سفید براق سے دانت چمکتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ چاند بادل کی اوڑھنی ہٹا کر سامنے آگیا ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی لیکن مدبھری آنکھوں میں مجھے کائنات مستی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ شاعروں کی تعزیرات ہند میں ناقابل معافی گناہ ہیں۔ لیکن میرے لئے وہ سیب ہیں۔ سیب سے بھی زیادہ میٹھے۔ اس کے چہرے کے وہ اعضا جن کا الگ الگ امتحان لو تو لغات شاعری میں ان کے لئے کوئی اچھا لفظ نہیں ملے گا۔ لیکن جب وہ ایک مجموعہ کی صورت میں نظر کے سامنے آتے ہیں۔ تو کھب جاتے ہیں نگاہ میں!

اس کے چہرہ پر جب میری نظر پڑتی ہے۔ تو میں کہہ نہیں سکتا۔ میری کیا کیفیت ہوتی ہے۔ وہاں۔ مجھے صباحت اور ملاحت کا جلوہ دکھائی دیتا ہے وہ جلوہ دوسروں کو نہ دکھائی دے۔ تو میں اس کا ذمہ دار کب ہوں؟ میرے دل پر اس کی رعنائی و زیبائی نقش ہے۔ دوسرے اسے چڑیل سمجھتے ہیں۔ سمجھیں مجھے کیا پروا؟"

"بیر بیرا! خوب تقریر کی تم نے شاباش قائل ہو گیا تمہارا"

"(جھک کر) آداب بجا لاتا ہوں اس قدر افزائی اور بندہ نوازی پر۔"

دونوں کھل کھلا کے ہنس پڑے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

شاہد نے ابھی تک اس گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔ لیکن ثریا کبھی کبھی اب اس کے ہاں جانے لگی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کوثر کو بھی لے جایا کرتی تھی۔ کوثر سے وہ بڑے اخلاق اور تپاک سے ملا کرتا تھا۔

ایک روز شاہد کے ہاں سے واپس آتے ہوئے کوثر نے کہا۔

"ثریا ایک بات پوچھوں"؟

"اجازت کی ضرورت ہے تمہیں"؟

میں یہ پوچھتی ہوں کہ شاہد میں کون سی ایسی بات ہے۔ جو تم دل ہار بیٹھیں؟ میرے بھیا تو لاکھ درجہ اچھے ہیں۔ صورت میں شکل میں۔ قد و قامت میں۔ بات چیت میں۔ ان حضرات کو بات کرنا بھی نہیں آتی۔ اور میرے بھیا تو بلبل کی طرح چہکتے ہیں۔ درجنوں لڑکیاں جان دیتی ہیں۔ ان پر۔ لیکن وہ کسی پر تھوکتے بھی نہیں،

ثریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کوثر کی گفتگو جاری تھی۔

"اللہ قسم بڑا جی چاہتا تھا۔ زندگی بھر ساتھ رہتے۔ اماں کو کتنی حسرت تھی۔ کہ تمہیں بہو بنا کر لائیں۔ مگر تم نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ پگلی کہیں کی!

ثریا بدستور خاموش تھی۔ کوثر نے موقعہ غنیمت دیکھ کر کہا۔

"صدمہ بھیا کو بھی ہے اس کا۔ وہ منہ سے تو کچھ نہیں کہتے۔ لیکن میں آخر انہی کی بہن ہوں۔ خوب دیکھ رہی ہوں۔ کیسے کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں وہ"

ثریا نے کہا۔

"بہن تم بہت کچھ کہہ گئیں۔ اب کچھ میری بھی سنو گی"؟

"اے تو کیا کانوں میں ٹھوٹھیاں دیئے ہوئے ہوں میں۔ کہتی کیوں نہیں ہو؟ یہاں ہے کون یا میں یا تم!

"تمہارا خیال ہے۔ میں نے شاہد کا انتخاب غلط کیا۔ میری نظر انتخاب اختر پر

پڑنی چاہئے تھی۔ کیوں یہی نا"

"ہاں ہاں کہے جاؤ"!

"لیکن تم نے یہ نہ سوچا کہ دنیا میں صرف محبت ایک ایسی چیز ہے۔ جو بے وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ کم از کم اس کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ تم اختر کی تعریف کرتی ہو کہتی ہو۔ بہت سی لڑکیاں اس پر مرتی ہیں"

"کچھ جھوٹ تھوڑے کہتی ہوں"

"میں نے کب کہا۔ تم جھوٹ کہتی ہو —— ہاں وہ لڑکیاں خوبصورت اور حسین بھی تو ہونگی۔ کیوں؟

"بے شک"

"لیکن اختر نے نہیں ٹھکرایا —— ان کا حسن کام نہ آیا"

"بالکل نہیں"

"کیوں؟

"دل ہی تو ہے"

"یہ" یہی میں کہہ رہی ہوں۔ اصل بات یہی ہے۔ دل ہی تو ہے ہو گئی مجھے محبت شاہد سے اور ایسی ہوئی کہ اب دنیا میں اس سے زیادہ حسین خوبصورت دلکش کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر اختر جیسا حسین اور منور بھی ہیں"

"پاگل ہو تم تو!

"یہی سہی"

"اور لو مجھے کیا۔ میں نے تو ایک بات کہی تھی"

اب گھر قریب آ گیا تھا۔ گفتگو بند ہو گئی۔ اور دونوں بہنیں خاموشی کے ساتھ گھر میں داخل ہو گئی تھی۔

ایک مہینہ سے زیادہ کی مدت گذر گئی اس عرصہ میں کوئی خاص بات رونما نہیں ہوئی۔ سوا اس کے کہ پھوپھی جان کا آفتاب اقبال نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔

ایک روز ثریا حسب معمول کوثر سے گھل مل کر باتیں کر رہی تھی کہ دستر خوان بچھ گیا۔ سب نے ساتھ مل کر کھانا کھا کر سب لوگ اپنے اپنے کمرہ میں لیٹنے چلے گئے گھر بھر قیلولہ کا عادی تھا۔

ثریا اپنے کمرہ میں آئی۔ اس نے اپنا بستر جھاڑا تو تکیہ کے نیچے ایک نہائت معطر اور خوش نما لفافہ رکھا دکھائی دیا۔ پتہ دیکھا تو اسی کا نام۔ سوا گ سے پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔

اس نے لفافہ چاک کیا۔ خط کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

"ثریا"

آج پہلی دفعہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں مخاطب کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

میں نے ایک سے ایک خوبصورت عورت بڑی بڑی فتنۂ زماں اور سحر طراز عورتیں جن پہ دیکھنے والے پروانہ وار فدا ہوتے تھے۔ دیکھیں لوگوں نے دلوں پر جن عورتوں کے حسن و جمال کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ جنہیں دیکھ کر سینہ میں دل مچلنے لگتا تھا۔ وہ میری نگاہوں سے گذریں۔ میں نے انہیں بھی دیکھا جنہیں اپنے حسن پہ جوانی پہ، ناز تھا۔ انہوں نے اپنے شباب کو بھی قدموں

پہ لا کر رکھ دیا۔ اپنی جوانی میری جھولی میں ڈال دی۔ اپنا حسن مفت مجھے بخش دیا۔ لیکن میرا دل اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔

میں نے تمہیں دیکھا اور ایسا معلوم ہوا۔ میرے دل نے پچھاڑ دیا۔ مجھے میں بے بس ہو گیا۔ جو سر کسی عورت کے آگے نہ جھکا تھا۔ اسے تم نے جھکا لیا۔ داد دیتا ہوں تمہیں۔ تمہارے تیرِ نظر کو جس نے میرا دل چھید لیا۔

ے

تیر پہ تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

میں اب تم سے پوچھتا ہوں کہ اس زخم رسیدہ شکست خوردہ دل کو کیا کروں۔ بتاؤ تم مجھے۔ میں اسے نذر لے کر آیا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اگر تم چاہو۔ تو اسے ٹھکرا بھی سکتی ہو۔ ٹھکرا دو۔ تمہاری ٹھوکروں سے پامال ہو کر کام آ جائے گا یہ قسمت اس کی سدھر جائے گی۔ مر جائے گا لیکن وہ موت جس پہ ہزاروں زندگیاں قربان کی جا سکتی ہیں

ے

درد دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

میں تم سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میری زندگی چاہتی ہو۔ تو موقع دو کسی طرح بھی کہیں بھی۔ صرف دس منٹ کے لئے میرے دل کی فریاد میری زبان

سے اور اپنے کانوں سے سن لو۔ بس!

یہی آرزو ہے۔ یہی مدعا ہے۔

صرف تمہارا

اختر

ثریا نے یہ خط پڑھا۔ اور غصہ سے بے تاب ہو گئی۔ وہ کمرہ میں ٹہلنے لگی اسے اختر سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ اس کے گولی مار دے۔ اس کا جی چاہا۔ منصور کو حقیقت حال سے باخبر کر دے۔ وہ جھپک کے اپنے کمرہ سے نکلی۔ اور بڑی پھرتی کے ساتھ اوپر پہنچ گئی۔ منصور وہاں نہیں تھا۔ وہ الٹے پاؤں واپس آئی۔ راستہ میں کوثر کا کمرہ بالکل الگ تھلگ تھا۔ قریب پہنچی تو اس نے سنا۔ منصور اور کوثر کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی ہے۔ وہ چونکی۔ ٹھٹکی اور دروازہ کی اوٹ میں کھڑی ہو کر سننے لگی۔

"منصور! تم اتنے سنگ دل کیوں ہو"؟

"کیا خوب سنگ دلی تو تم سکھا رہی ہو"

"میں"؟

"ہاں تم!"

"وہ کیسے"؟

"تمہارا مطلب یہی تو ہوا کہ میں صنوبر کو چھوڑ دوں۔ اور تمہارا ہو رہوں۔ یہ سنگ دلی نہیں ہے کہ میں اسے بے خطا۔ بے قصور چھوڑ دوں جسے اپنا چکا ہوں"

"اس موٹی لونڈی کا کیا ذکر۔ کچھ میری اس کی برابری ہے"؟

"یہ میرے دل سے پوچھو"

"تم اسے ترجیح دیتے ہو مجھ پر؟"

"ساری دنیا پر ترجیح دیتا ہوں اسے!"

"مجھے ٹھکراتے ہو"؟

"اگر یہ ٹھکرانا ہے تو بے شک ٹھکراتا ہوں تمہیں"

"یہ میری محبت کا صلہ ہے؟"

"زبردستی کی محبت کا میں قائل نہیں"

"اتنا خشک جواب دو گے۔ ایسی ٹیڑھی ٹیڑھی باتیں کرو گے؟ یوں میرا دل اپنے پاؤں تلے روندو گے؟ اس طرح میری آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کرو گے؟

(رونے لگتی ہے)

"میری طرف دیکھو۔ میں تمہیں چاہتی ہوں دل و جان سے"!

"شکریہ۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ میں صنوبر کو دل و جان سے چاہتا ہوں"

"میں تو یہ نہیں برداشت کر سکتی اچھی"

"تو گالیاں دے لو مجھے"

"اس سے میرا دل ٹھنڈا نہیں ہو گا!"

"تو جوتی اتار و مار لو مجھے"

"یہ میری پاپوش کرے"

"پھر کیا کرو گی؟ آخر کو خلاصی کی بھی کوئی صورت ہے"؟

"میں تمہیں رسوا کر دوں گی۔ ذلیل کر دوں گی کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں

رہو گے"۔

"وہ کس طرح؟"

"تم میرے کمرہ میں کیوں آئے؟ میں جوان ہوں۔ تم جوان ہو۔ ایک جوان عورت کے کمرہ میں دوپہر کے وقت جب سارے گھر پہ سناٹا چھایا ہوا ہے۔ تم گھس آئے۔ کیا میں بھی صنوبر ہوں۔ موئی دو کوڑی کی ذلیل چھوکری۔ مجھے اپنی عزت کا ناموس کا، عصمت کا پاس ہے۔ میں ایسے آبرو کے ڈاکوؤں کے ہتھکنڈے جانتی ہوں ــــ دیکھو۔ اب بھی مان جاؤ۔ نہیں تو چیختی ہوں میں"؟

"لیکن تم نے بلایا تھا مجھے ایک بات کہنے کے لئے"!

"اے ہے بڑے آئے بات سننے والے۔ میں تم سے اکیلے میں بات کیوں کرنے لگی۔ تم میرے ہوتے کون ہو ــــــــــــ مجھے بات کرنی تھی۔ تو میں تمہارے کمرے میں جاتی۔ تم میرے کمرے میں کیسے آ گئے۔ بڑے بھولے بنے پھرتے ہیں بچارے"!

"تم اتنی چالاک ہو"؟

"میں چالاک والاک کچھ نہیں جانتی۔ سیدھے سے مانتے ہو تو خیر ورنہ میں پکارتی ہوں سارے گھر بھر کو"!

منصور کے آگے گے حواس جاتے رہے۔ اس کی سمجھ میں آتا نہیں آتا تھا کیا جواب دے۔

اتنے میں تڑ سے دروازہ کھول کر ثریا کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسے دیکھ کر ذرا کی ذرا کوثر جھجکی۔ لیکن فوراً ہی رونے لگی۔ کہنے لگی ثریا سے۔

"دیکھو اپنے بھیا کے کرتوت۔ مجھ پر ڈورے ڈال رہے تھے۔ ابھی تم نہ آ گئی

ہوتیں۔ تو انہوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا تھا۔

منصور ہکا بکا کھڑا تھا۔ اور کوثر روئے چلی جا رہی تھی۔

ثریا کڑکی۔

"بند کرو کوثر یہ ٹسوے۔ سب جانتی ہوں میں۔ میرا بھائی تم جیسی چھوکریوں پہ نگاہ بھی نہیں ڈالتا۔ تم نے کمند پھینکی۔ لیکن وہ نکل گیا بچ کر"!

"تم بھی انہیں کی سی کہنے لگیں۔ ثریا! تم تو عورت ہو۔ تم تو عورت کا ساتھ دو"!

"خواہ مخواہ ساتھ دوں۔ تم میرے بھائی کو ورغلاؤ۔ اور ساتھ دوں میں تمہارا"۔

کوثر پھر رونے لگی۔ ثریا نے کہا۔ میں سب کچھ سن رہی تھی۔ تمہاری ایک ایک بات میں نے دروازہ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر سنی ہے۔ تمہاری بے تابیاں بھی دیکھی ہیں میں نے اور رنگوں ساریاں بھی۔ تم عشق کا سوانگ بھی خوب رچاتی ہو۔ اور دلالی کے فن سے بھی خوب واقف ہو۔ میرے کمرے میں کوئی نہیں جا سکتا۔ میرے تکیہ کے نیچے اختر کا محبت بھرا خط صرف تم ہی رکھ سکتی تھیں۔ اب میں سمجھی تم لوگوں کے آنے کا مقصد کیا تھا۔ تم میرے بھیا کو اسیر زلف کرنا چاہتی تھیں۔ اور تمہارے بھیا مجھے رجھانا چاہتے تھے۔ لیکن تم نے غلط انتخاب کیا۔ نہ میرے بھیا ایسی کچی گولیاں کھیلے ہیں کہ تمہارے پھندے میں گرفتار ہو جائیں۔ نہ میں اتنی احمق ہوں کہ تمہارے بھائی صاحب مجھے میرے راستے سے منحرف کر دیں"۔

کوثر بالکل خاموش تھی اور ثریا کہے جا رہی تھی۔

خوب یاد آیا۔ اس روز جب شاہد کے ہاں سے ہم دونوں واپس آ رہے تھے

کس مزے میں شاہد کی برائیاں کی جا رہی تھیں۔ اور اختر کے گن گائے جا رہے تھے۔ یہ تھی چال!

منصور نے کہا۔

"ہاں مجھے بھی یاد آیا۔ یہ اختر میرے سامنے جب دیکھو۔ جب کوثر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملایا کرتا تھا۔ اور شاہد کی خواہ مخواہ برائیاں کیا کرتا تھا۔ سچ کہتی ہو تم ثریا! ان دونوں کے آنے کا مقصد یہی تھا۔ کہ ہم دونوں پہ ڈورے ڈالیں۔"

ثریا نے کہا۔

"اور کیا؟ خوب سمجھ گئی میں ان دونوں کو۔ میں اگر اس وقت نہ آگئی ہوتی۔ تو بھیا تم تو اتنے حواس باختہ ہو گئے تھے کہ یہ چیخ چیخ کر گھر بھر کو جمع کر لیتی۔ اور تمہارے بنائے بچے نہ بنتا مفت میں نکو ہو جاتے تم!"

ثریا پھر کوثر سے مخاطب ہوئی۔

تم بھائی بہنوں نے وہ حرکت کی ہے جو کبھی معاف نہیں کی جا سکتی۔ تمہارے ساتھ ایسا برتاؤ ہونا چاہئے کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ میرا جی چاہتا ہے تم دونوں کے نقاب الٹ دوں اور بتا دوں گھر بھر کو کہ دیکھو ان کا اصلی چہرہ یہ ہے۔ لیکن میں معاف کرتی ہوں۔ شرط یہ ہے کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر تم بھائی بہن مع اپنی ماں کے یہ گھر چھوڑ دو۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

یہ کہہ کر ثریا منصور کے ساتھ باہر نکل آئی۔ اور کوثر وہیں بیٹھی رہی۔

دوسرے روز پھوپھی جان کا بوریا بندھ گیا۔ امی جان نے، شاکر نے سب نے روکا۔ مگر وہ فیصلہ کر چکی تھیں۔ انہوں نے اپنا بندھا ہوا اسباب نہ کھولنا تھا۔ نہ کھولا۔ بہت اصرار ہوا۔ تو کہنے لگیں۔ مقدمہ کے سلسلہ میں فوراً جانا ہے اور نہ لاکھ کا لیکھ ہو جائے گا۔

پھوپھی کو رخصت کرنے کے لئے منصور اور ثریا بھی آگئے۔ سب سے وہ رو رو کر وداع ہوئیں۔ ثریا کو بھی گلے لگایا۔ اور منصور کو بھی۔ لیکن ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ بے بس ہیں ہم ورنہ تم دونوں کو کچا چبا جاتے۔

پھوپھی جان کو چلتے وقت منصور نے اور ثریا نے سلام کیا۔ انہوں نے گردن کے اشارہ سے دعا دی۔ مگر شاکر کو گلے سے لگا کر رونے لگیں۔ آج ان کا دل شاکر کی محبت سے لبریز تھا۔ ثریا اور کوثر میں معانقہ اور منصور و اختر میں مصافحہ ہوا۔ لیکن اس معانقہ اور مصافحہ میں نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اسے دیکھنے والے نہیں محسوس کر رہے تھے۔ صرف گلے ملنے والے اور ہاتھ ملانے والے محسوس کر رہے تھے۔

پھوپھی جان چلی گئیں۔ گھر سونا ہو گیا۔ وہ چہل پہل رخصت ہو گئی۔ جو ان کے دم سے تھی۔ شاکر ان کے جانے سے بہت غمگین ہوا۔ وہ شاید سوچ رہا تھا کہ یہ آخری کوشش بھی ناکام ہوئی۔

باب ۳۸

نیا مطالبہ

عشا کی نماز پڑھ کر امی جان اپنی چارپائی پر سونے کے لئے لیٹ چکی تھیں کہ شاکر پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے لیٹے لیٹے تکیہ دوہرا کر کے سر اونچا کر لیا۔ اور کہا۔

"کوئی کام ہے؟"

"بہت ضروری کام ہے آپ سے"

"کہو کیا کام —— اے ہاں یہ تمہاری پھوپھی جان تو خوب گئیں۔ یا تو اس طرح رہ رہی تھی جیسے مر کے نکلیں گی یہاں سے۔ یا ایک دم بستر اٹھایا اور یہ جا وہ جا بھئی عجب رنگ ہے ان کا"

"امی جان پھوپھی جان پر لعنت بھیجئے۔ اچھا ہوا دفع ہو گئیں۔ میں ایک اور

معاملہ میں مشورہ لینے آیا ہوں آپ سے"

"کہہ تو رہی ہوں کہو کیا بات ہے"؟

"آپ بھی بعض وقت غضب کی غلطی کر جاتی ہیں"۔

"کیا کیا میں نے لڑکے! یہ دکوئی نہیں ملا تو میں سہی کوئی تو چاہیئے لڑنے کے لیئے"۔

"آپ نے ثریا اور منصور دونوں کو معاف کر دیا"۔

"ہاں کر دیا"۔

"اب وہ اور شیر ہو نگے۔ منصور نے وہ کیا۔ جو کسی شریف آدمی نے آج تک نہیں کیا تھا۔ ثریا نے وہ کیا جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور آپ نے ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر لگا لیا انہیں کلیجے سے"!

"تو کیا سُولی دے دیتی انہیں"!

"یہ میں کب کہتا ہوں"

"مطلب تو یہی ہے تمہارا"۔

"میرا مطلب صرف یہ تھا کہ اگر میرے ساتھ آپ بھی ان سے خفا رہتیں۔ تو وہ راہ راست پر آجاتے۔ میاں منصور تو صنوبر کی جوانی پر ریجھے ہیں۔ یہ ندی آج چڑھی ہوئی ہے کل اتر جائے گی۔ یہی حال ثریا کا ہے۔ وہ بھی جب یہ دیکھتی کہ سارا گھر اسے چھوڑے دے رہا ہے تو آجاتی راستہ پر۔ مگر امی جان آپ نے تو سارا کھیل بگاڑ دیا۔

rekhta

"میں نے بیسا کھیل دیا کچھ نہیں بگاڑا — اولاد نالائق ہو تو بھی ماں سے نہیں چھوڑ سکتی۔"

"چاہے وہ خاندان کی ناک کٹا دے اپنے لچھنوں سے۔"

"اے چلو بھی بڑے آئے ناک والے۔ تم زہرہ سے شادی کر رہے تھے۔ تب یہ ناک کہاں چلی گئی تھی۔ تم نے یاسمین کو رانی بنا دیا۔ تب یہ ناک کیوں رہ گئی تھی۔ کبھی کونے میں —— میرے سامنے بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناؤ، ہاں!"

"امی جان آپ تو الٹی مجھی پر پلٹ پڑیں۔ آپ کا مزاج بھی خوب ہے۔ گھڑی میں کچھ۔ گھڑی میں کچھ۔"

"بے میرے بیان نہ بکھارو بیٹا! نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ اور سنو!"

"آپ کی خوش ذوقیٔ مزاج کا پہلا پھل تو یہ ہوگا کہ ہر چیز کے حصے بخرے ہو جائیں گے۔ جو عمارت ہمارے باپ دادا نے اپنا خون پانی ایک کر کے بنائی تھی۔ اسے کھنڈر بنا دیں گے منصور اور ثریا۔"

"نہیں کیا۔ وہ جانیں ان کا کام —— جو حصہ ان کا نکلتا ہے الگ کر دو۔ جب ان کا حصہ ہی ہے۔ تو دینا ہی پڑے گا۔ خوشی سے نہیں دو گے وہ عدالت کچہری کر کے چھین لیں گے۔"

"آپ اس پر بھی راضی ہو گئیں؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو شاکر، میرے راضی ہونے نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ تم کسی کا حق دبائے بیٹھے رہو گے۔ وہ کب تک چپ سادھے رہے گا؟ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ وہ دونوں (منصور اور ثریا) کیسے ہی برے سہی۔ مگر شرافت کر رہے ہیں۔ جو پچھلا حساب نہیں مانگ رہے ہیں۔ اسی کو غنیمت سمجھو اور حصہ دے کر جھگڑا چکاؤ۔"

"اچھی بات ہے۔ میں حصہ دے دوں گا ان دونوں کا۔ لیکن ایک بات مانیے آپ میری۔"

"کون بات؟"

"آپ کی ذاتی جائداد جو ہے۔ اس سے ان دونوں کو محروم کر دیجئے۔ اسے میرے نام ہبہ کر دیجئے۔ تاکہ کچھ تو سزا ملے انہیں اپنی بدمعاشی کی۔"

"کیا کہا تم نے۔ محروم کر دوں انہیں؟"

"جی ہاں!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں کیا قباحت ہے اس میں؟"

"کیا منصور میرا لڑکا نہیں ہے؟ کیا ثریا میری لڑکی نہیں ہے؟ وہ ذاتی [illegible] میں بٹے گی وہ بھی اب نہیں میرے بعد۔ جب میں مر جاؤں گی۔"

"گویا یہ آپ انعام دے رہی ہیں انہیں۔"

"جو سمجھو یہی سہی —— بس ان ماؤں میں نہیں ہوں کہ ایک

آنکھوں میں نور بھرا ایک آنکھ میں خدا کا قہر میرے لئے تو سب برابر ہیں۔"

"میں سچ مچ تھوڑے آپ کی جائداد پر قابض ہونا چاہتا ہوں۔ ان دونوں کے دکھلانے کو میرے نام کر دیجئے۔ پھر جب یہ اپنے ڈھنگ بدل لیں گے تو میں انہیں ان کا حصہ دے دونگا۔"

"بیٹا یہ کام میں جھوٹ موٹ بھی نہیں کروں گی۔ میری جائداد کے تین حصے ہوں گے۔ برابر۔ برابر برابر ایک تمہارا، ایک منصور کا۔ ایک ثریا کا۔ نہ کم اور نہ زیادہ۔"

"ارے یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"لڑکی کا حصہ لڑکے سے کم ہوتا ہے۔ اسے بھی آپ برابر کا شریک بنائے دے رہی ہیں۔"

"ہاں! میں جانتی ہوں کم ہوتا ہے۔ لیکن میں تو اپنی جائداد ہبہ کر رہی ہوں۔ اور ہبہ میں جائداد والے کو اختیار ہے۔ جسے جتنا چاہے دے دے!"

"یہ بھی خوب رہی!"

"میرا بس چلتا۔ تو میں اپنی ساری جائداد ثریا کو دے دیتی۔ چاہے کسی کو برا لگے یا بھلا۔ میں اسے سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔ پھر میں نے سوچا۔ کہیں بہن بھائیوں میں ناچاقی نہ ہو جائے۔ اس لئے برابر برابر سہی۔"

"ناچاقی اس برابر برابر سے بھی ہو گی۔ یہ بھی تو زیادتی ہے!"

"اگر یہ ہوا بیٹا! تو جہاں سیر بھر وہاں سوا سیر۔ پھر تو میری جائداد کی مالک ثریا ہی بنے گی —— ہاں سوچ لو!"

"آپ کی جائداد ہے۔ آپ کسی چمار کو بھی بخش دیں۔ مجھے کیا!"

"یہی سہی۔ آگے کہو!"

"مجھے نہیں چاہئے آپ کی جائداد میں سے کچھ حصہ!"

"دوانہ ہوا ہے لڑکے! تیرے گلے کون منڈھ رہا ہے۔ نہیں چاہئے تو نہ لے!"

"اب تک ساری ذمہ داری منصور اور ثریا پر تھی۔ اب آپ بھی ان کی اس ذمہ داری میں شریک ہو گئیں۔ بڑا برا ہوا یہ جو سنتا ہے کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہے۔ میری تو شرم سے گردن نہیں اٹھتی!"

"دے لے انگلیاں کانوں میں جس کا جی چاہے۔ نہ اٹھے تمہاری گردن۔ میں نہ کسی کے ہاں منصور کا پیام لے کر جا رہی ہوں۔ نہ ثریا کے لئے منتظر ہوں کہ کہیں سے بات آئے —— کانوں میں انگلیاں دینے والے اپنے گھر خوش رہیں ہم اپنے گھر خوش ہیں۔"

"امی جان! آپ تو ایک ہی دن میں بدل گئیں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ تمہیں ہوا ہے۔ جو بھائی بہن کو ماں کی جائداد سے محروم کرنا چاہتے ہو۔ دماغ کی دعا کرو۔ دماغ کی دوا!"

"اچھا اب سوئیے آپ۔ میں جاتا ہوں۔"

"—سدھارو"

شاکر کمرہ سے باہر نکلا۔ اور امی جان نے "تکیہ ٹھیک کیا۔ آنکھیں بند کیں اور لیٹ گئیں کروٹ بدل کر!"

باب ۳۹

موت

ہنگامہ آرائیوں کے ابتدائی دور میں رضیہ اپنے سسرال میں تھی۔ لیکن گھر والوں کی بے گانگی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ زہرہ کے دور تک شاکر کسی نہ کسی حد تک گھر سے وابستہ تھا۔ لیکن یاسمین نے اس طرح اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ کہ وہ عارف اور رضیہ دونوں کو مرحوم سمجھنے لگا تھا۔ وہ اپنے میکہ سے بن بلائے سسرال آگئی تھی۔ پھر اس کا جی گھبرا یا۔ بن بلائے سسرال سے وہ میکہ چلی گئی۔

وہاں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ سب ہی اس کا مان رکھتے تھے۔ شاکر کے کرتوت اب سب جان گئے تھے۔ رضیہ کا صبر و تحمل سب دیکھ رہے تھے۔ قدرتاً اس گھر کے سب لوگوں کو اس سے بڑی گہری ہمدردی ہو گئی تھی۔ سب اسے دیکھ

دیکھ کر کڑھتے تھے دیکھ رہے تھے۔ اس کی جوانی کا گل صد رنگ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ شباب کی شوخی کی جگہ غم کے بڑھاپے نے لے لی ہے۔ وہ ہر معاملہ پر گفتگو کرتی تھی۔ نہ سنتی تھی۔ لوگ جانتے تھے اس ذکر سے اس کا دل دکھے گا۔ وہ خود کنائی کاٹ جاتے تھے۔

وہ اپنے کمرہ میں لیٹی ہوئی تھی۔ گزرا ہوا زمانہ اس کے تصور کی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح پھر سے گزر رہا تھا۔

اس کے سامنے شاکر کی تصویر آئی۔ محبت کرنے والا شوہر جان چھڑکنے والا عاشق یہ تصویر جلد ہی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئی۔ پھر منصور ——— اس سے بے محابا عشق و محبت کا اظہار کرتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ تصویر بھی شعلۂ مستعجل کی طرح جلدی جلدی ابھری اور فضا کی پہنائیوں میں گم ہو گئی۔ اب ہاشم کی تصویر آئی۔ یہ تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آ کر جم گئی۔ پچھلی باتیں ایک ایک کر کے اسے یاد آنے لگیں۔ وہ بچپن میں دونوں کا ساتھ کھیلنا۔ کھیلتے کھیلتے لڑنا۔ اس کا روٹھ جانا اور ہاشم کا منانا۔ ہاشم کا اس کے ساتھ شرارتیں کرنا۔ اس کا ہاشم کو گدگدانا۔ دھول دھپا۔ کھیل کود۔ شرارت۔ سنجیدگی۔ دوستی دشمنی۔ میل۔ رنجش چند لمحوں کے اندر اتنی ایک کیفیتوں کا طاری ہونا اور پھر ان کے بعد دونوں کا اس طرح سب کچھ بھول جانا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

پھر ابا جان کا شاکر کو پسند کرنا۔ بغیر میری رائے لئے ہوئے اس کے ساتھ شادی کر دینا۔ میرا اکیلے میں رونا۔ بلکنا۔ ہاشم کو یاد کرنا۔ لیکن سب کے سامنے

خاموش ہو جانا۔ قاضی جی کا آنا اور نکاح پڑھانا۔ شاکر کے گھر جانا اور اس کی محبتوں میں غم کی تلخی کا کم ہو جانا۔ محبت پر شوہر کی وفاداری کے جذبہ کو غالب رکھنا اپنے اوپر زبردستی اس کی محبت طاری کرنا اور سچ مچ اس سے محبت کرنے لگنا۔ دُنیا کی ہر چیز کو اس کے مقابلے میں ہیچ سمجھنے لگنا۔

پھر شاکر کا زہرہ پر فریفتہ ہونا اور مجھے بالکل بھول جانا۔ فراموش کر دینا۔

پھر ہاشم کا آنا۔ پوری رعنائی اور دل آویزی۔ خوبی اور خوبروئی۔ رنگینی اور سحر طرازی کے ساتھ اس کا کمند پھینکنا اور میرا بچ کر نکل جانا۔ یہ عزم مصمم کر لینا کہ میں شاکر کی ہو چکی۔ اور اب میرا اس کے سوائے کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس عزم سے دل کی لگن کی لڑائی۔ کشتی۔ تصادم۔ کشمکش لیکن میرا سب پر غالب آنا اور ہاشم کو جواب صاف دے دینا۔

پھر اس کا دل برداشتہ ہو کر دارجلنگ چلے جانا۔ میرا شاکر کے ہاں جانا۔ وہاں سے پہلے سے زیادہ حقارت کا برتاؤ اور پھر اپنے گھر واپس آ جانا۔

یہ سب باتیں بڑی تیزی کے ساتھ اس کے دماغ کے فلم پر نمایاں اور متحرک ہو رہی تھیں۔ دفعتہً اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے تکیہ سے منہ ڈھانپ لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تکیہ تر ہو گیا۔ لیکن اس کی آنکھوں کا سمندر خشک نہ ہوا۔ وہ تو اس وقت مدّ و جزر کے جھکولے کھا رہا تھا۔ طوفان بردوش تھا۔ اس کا بہاؤ روکے نہیں رکتا تھا آنکھوں کے سمندر کی پُرشور، تند طاقتور اور سر بفلک موجوں کو پلکوں کی کمزور فصیل کیونکر روک پاتی۔ وہ آ رہا تھا۔

اور پلکوں کے دریچوں میں رستہ بناتا ہوا آبشار کی طرح گرنے لگتا تھا۔

اتنے میں منشی جی نے آواز دی۔ یہی اب ہاشم کے منیجر اور مختار کل تھے۔ گھر کے بڑے بوڑھے مانے جاتے تھے۔ کئی پشتوں سے اسی گھر کی خدمت کر رہے تھے ان سے گھر بھر میں کوئی پردہ نہیں کرتا تھا۔ یہ گھر میں آزادانہ آمد و رفت رکھتے تھے۔

رضیہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھے۔ بال درست کئے۔ دوپٹہ سر پر رکھا اور کہا۔

"آ جائیے"

"آ گئے وہ"۔ رضیہ نے پوچھا

"کب آئے آپ دارجلنگ سے"؟

"ابھی آیا ہوں بیٹی۔ اور سیدھا تیرے پاس چلا آ رہا ہوں"۔

"ہاشم اچھے ہیں"

منشی جی رونے لگے۔ رضیہ گھبرا گئی۔ اس نے کہا۔

"ارے آپ رو کیوں رہے ہیں؟ کیا ہوا۔ خدا کے لئے کچھ بتائیے تو!"

کیا بتاؤں بیٹا!" (پھر رونے لگے)

"وہ زندہ تو ہیں"؟

"میرے آنے تک تو سانس چل رہی تھی"۔

"بیمار ہیں وہ"؟

"بیمار نہیں (آواز بھرا گئی) لب گور ——— نہ جانے کہاں سے انہیں ایک چھوکری کملا مل گئی۔ کہتے تھے۔ خریدا تھا۔ کسی آدمی راموسے۔ ہزار جان سے فدا ہے ان پر۔ نہ سوتی ہے نہ کھاتی ہے۔ انہیں شراب پلایا کرتی ہے۔ پاؤں دبایا کرتی ہے اور جب وہ زور سے دل پکڑ کر بے حال ہونے لگتے ہیں۔ تو انہیں دیکھ دیکھ کر رونے لگتی ہے۔ دل کے دورے تو اب اکثر پڑا کرتے ہیں"۔

"کون ہے یہ کملا؟"

"بڑی اچھی لڑکی ہے بیٹا!"

"لیکن ہے کون؟"

"خود ہی بتا رہی تھی۔ کسی اچھے گھرانے کی لڑکی تھی۔ راموسے بھگا لایا۔ اور پیشہ کرانے لگا۔ وہاں کہیں یہ پہنچ گئے۔ اس نے دیکھا۔ یہ ویسا گاہک نہیں ہے جیسے روز آیا کرتے ہیں۔ روپیہ پانی کی طرح بہاتا ہے۔ رات رات بھر رہتا ہے۔ لیکن نہ آنکھوں میں ان کی ہوس کا شیطان ناچتا ہے۔ نہ چہرے پر اس کے شیطان کی ہوس کھیلتی ہے۔ شراب پیتا ہے نشہ کے لئے نہیں کسی کی یاد میں کھو جانے کے لئے کسی کو بھول جانے کے لئے موت کو دعوت دینے کے لئے: سے ایسے نرالے آدمی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس نے کہا مجھے اس دنیا سے نکالو۔ میں تمہارے چرنوں میں رہنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ کہنے لگے۔ پگلی کہیں کی اس دل میں رہنا چاہتی ہے جو میرا نہیں ہے۔ اس گھر میں بسنا چاہتی ہے جو خود بنا بھی نہیں ہے۔

تجھے روپیہ چاہئے۔ تو روپیہ لے۔ جتنا جی چاہے مانگ مل جائے گا تجھے۔ لیکن اس سے اگر آگے بڑھے گی۔ تو پچھتائے گی۔ اس نے کہا۔ مجھے روپیہ نہیں چاہیئے تمہاری محبت بھی نہیں چاہیئے۔ تمہارا جس کو جی چاہے پوجو۔ لیکن میری محبت کے دروازہ پر تو تالا نہ لگاؤ۔ میں تمہاری داسی بن کر۔ یا بہت میری عزت کرو تو بہن بن کر۔ تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتی۔

رامو سے بات چیت ہوئی۔ سودا ہو گیا۔ آ گئی کملا ان کے پاس۔ میں تو بیٹا اس لڑکی کے جگر کو کہتا ہوں۔ اور کوئی ہو۔ تو ان سے نفرت کرنے لگے۔ بڑے بڑے بال بڑی لمبی سی داڑھی۔ جب سے دار جلنگ گئے ہیں خط بھی نہیں بنوایا۔ بڑے بڑے ناخون۔ منہ سے ہر وقت شراب کی بھبک۔ ہر وقت شراب کے نشہ میں دھت۔

لیکن وہ اس طرح ان کی سیوا کرتی ہے۔ کہ لیلیٰ نے مجنوں کی اس طرح سیوا کی ہوگی۔ میں تو یہ تماشہ دیکھ کر دنگ رہ گیا بیٹا!

"بہت ابتر ہو گئی ہے حالت؟"

"ابتر؟ ارے بے ان میں رہا کیا ہے بیٹا! دیوانے تو وہ تھے ہی ہیں کمرہ میں دو تصویریں لٹک رہی ہیں۔ ایک ان کی خود کی ایک تمہاری جب دیکھو۔ جب تصویروں سے باتیں کر رہے ہیں۔ نہ معلوم کیا اول فول بکا کرتے ہیں۔ گھنٹوں گزر جاتے ہیں کمرہ میں اکیلے بیٹھے ہوئے کملا کو اجازت نہیں ہے کہ ان کی باتوں میں مخل ہو۔ بے چاری پہروں کھانا لئے دروازہ پر کھڑی رہتی ہے۔ جب باتیں کرتے کرتے

تھک جاتا ہے۔ تب کملا کو حاضری کی اجازت ملتی ہے۔ بڑی سخت تاکید ہے۔ نہ ہماری باتیں سنو۔ نہ ہماری باتوں کے وقت ہم سے کوئی بات کرو۔ کملا تو بڑی احتیاط کرتی ہے۔ ایسے موقعہ پر دور ہی دور رہتی ہے۔ میں نے کئی دفعہ سننے کی کوشش کی۔ کہ آخر دیکھوں تو کیا باتیں کرتے ہیں۔ مگر کمرہ ہوتا اندر سے بند۔ وہ باتیں کرتے ہیں۔ چپکے چپکے بس بھنبھناہٹ سی معلوم ہوتی ہے اور بس!

"میں کیا پوچھ رہی ہوں اور آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کیا پوچھا تم نے بیٹا!"

"صحت کیسی ہے؟"

"میرے سامنے سول سرجن آیا تھا۔ کہہ رہا تھا یہ اب بچنے کے نہیں۔ جب تک چل رہے ہیں۔ چل رہے ہیں۔ کوئی بڑا صدمہ پہنچا ہے انہیں۔ میں نے لاکھ ٹوہ لگائی۔ مگر ان سے بھلا پوچھ سکتا ہے کوئی ان کا راز۔"

رضیہ کے چہرہ پر اس وقت تاثر کی جو کیفیت تھی۔ اسے الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ منشی جی ذرا سے رکے۔ پھر کہنے لگے۔

"ہاں بیٹی! تمہیں بہت پوچھ رہے تھے وہ۔"

"کیا پوچھ رہے تھے؟"

"پوچھ رہے تھے۔ خوش ہے رضیہ۔"

"آپ نے کیا جواب دیا؟"

"بیٹا میں جھوٹ کیوں کہتا۔ جو دیکھتا ہوں۔ وہی سنا دیا انہیں۔"

"کیا سنایا آپ نے؟"

"وہی شاکر میاں کی حرکتیں۔"

"کیا بولے وہ؟"

"بولتے کیا وہ اُلٹے تو بیٹھے ہیں۔"

"آخر کچھ تو؟"

"شاکر کی زیادتیاں سن کر جب میں نے کہا۔ رضیہ بیٹا! بہت نڈھال رہتی ہیں۔ ڈاکٹروں نے وِق تجویز کی ہے۔ تو آؤ دیکھا نہ تاؤ کہنے لگے: "چُپ بے بوڑھے کھوسٹ" اور یہ کہہ کر ایک طمانچہ مار دیا میرے گال پر ——

یہ حالت ہے ان کی۔ ان کے باپ نے کبھی آپ کے سوا تم سے بات نہ کی۔ انہوں نے چانٹا جڑ دیا میرے۔ لیکن میں بھی برا کیا مانوں۔ وہ اپنے ہوش میں کب ہیں؟"

"انہیں یہاں کیوں نہیں لے آتے؟"

"ایک دفعہ؟ دس دفعہ کہہ چکا ہوں۔"

"کیا کہتے ہیں وہ؟"

"کہتے ہیں تم دارجلنگ کو کہہ رہے ہو۔ میں تو تمبکٹو جانے والا ہوں جہاں تم پہنچ بھی نہیں سکتے۔ جب دیکھو۔ جب آ کر بہت پریشان کیا کرتے ہو تم —— یہ ہیں ان کی باتیں۔ میں جاتا ہوں خیر خبر کے لئے۔ وہ علاج کرانا ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ میں پریشان کرتا ہوں۔ یہ تمبکٹو نہ جانے کونسا شہر ہے —— کہاں ہے؟ بیٹا! ایک بات کہوں سنو گی اس بڈھے کی؟"

"ضرور۔ کیا ہے وہ بات؟"

"تم چلو میرے ساتھ دارجلنگ۔ تم زور دو گی تو ضرور آ جائیں گے وہ۔"

"یہ کیسے جانا آپ نے؟"

"تمہاری بات وہ ہمیشہ سے مانتے آئے ہیں۔ اسے کبھی رد نہیں کریں گے۔"

"ایسا ہوتا تو جاتے کیوں؟"

یہاں منشی جی بھی قائل ہو گئے۔ انہوں نے گردن جھکا لی۔ اور فرش کے گل بوٹے دیکھنے لگے۔ پھر اٹھے اور چلے گئے۔

صبح کوئی دس بجے کے قریب منشی جی پھر گھبرائے گھبرائے سے آئے۔ کہنے لگے۔

"کملا کا تار آیا ہے۔ لکھا ہے حالت بہت نازک ہے۔ دل نہیں مانتا چلا جاؤں؟"

"فوراً جائیے"

"اور جو وہ خفا ہوئے تو؟"

"میرا نام لے دیجئے گا۔ کہئے گا میں نے بھیجا ہے۔ یہ بھی کہہ دیجئے گا۔ میں نے بلایا بھی ہے۔"

"تو ایک خط دے دو نا بیٹی"

"خط نہیں۔ وہ آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتے۔ آپ میری طرف سے زبانی کہہ دیجئے گا یہ سب کچھ!"

"اچھا بیٹا! یہی سہی"

منشی جی پہلی ٹرین سے دارجلنگ روانہ ہو گئے۔

وہاں پہنچ کر انہوں نے عجیب حال دیکھا۔ کملا کی روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ہاشم بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اس پر دل کے دورے پڑتے تھے۔ اور ہر دورہ پر یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ اب وہ نہیں بچے گا۔

منشی جی اس کے پاس پہنچے۔ اس کی یہ حالت دیکھی اور رونے لگے۔ ہاشم پر بے ہوشی سی طاری تھی۔ نرس پاس کھڑی تھی۔ اس نے انجکشن دیا۔ ہاشم نے آنکھیں کھولیں۔ منشی جی کو دیکھا۔

"پھر آ گئے آپ؟"

"ہاں۔ رضیہ نے بھیجا ہے مجھے۔ بلایا ہے تمہیں بیٹا!"

ہاشم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ نرس نے پھر لٹانے کی کوشش کی۔ اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ہاں! کیا کہا ہے رضیہ نے؟"

"کہا ہے چلے آؤ۔ یہاں رہو۔ میں تمہاری دیکھ بھال کروں گی۔"

"میں جان رہا ہوں۔ میں اب گھڑی بھر کا مہمان ہوں۔ یہ انجکشن مجھے زندگی نہیں بخش سکتے۔ مریض اپنی حالت ڈاکٹر سے زیادہ جانتا ہے۔ ڈاکٹر اگر کہتے ہیں میں اچھا ہو جاؤں گا تو بکتے ہیں۔ فیس کے لالچ میں کہتے ہیں یہ باتیں!"

"یوں نہ کہو بیٹا!" یہ کہہ کر منشی جی رونے لگے۔

ہاشم نے ڈانٹا۔

"آپ رو رو کر وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد خوب جی بھر کے رو لیجئے گا۔"

منشی جی چپ ہو گئے۔ کملا پٹی سے لگی چپ چاپ کھڑی تھی۔ خوبصورت کٹوریوں کی طرح اس کی آنکھیں آنسوؤں کے پانی سے بھری تھیں۔

ہاشم نے کہا۔

"آپ نے رضیہ سے میری حالت کہہ دی تھی؟"

"ہاں!"

"اور میں نے منع جو کیا تھا!"

"مار لو بیٹا جوتے۔ نہ رہا گیا مجھ سے وہ پوچھتی گئی میں کہتا گیا۔"

"کیا پوچھ رہی تھی؟"

"کرید کرید کے تمہاری باتیں!"

"روتی نہیں تھی؟"

"وہ رونے لگی کیا۔ وہ تو سر سے پاؤں تک آنسو بن گئی ہے۔ جانے کیا آ[illegible] ہے۔ اس کا بچنا......!"

"پھر وہی بدفال"

"بیٹا جو ڈاکٹر کہتے ہیں وہی میں کہہ دیتا ہوں۔"

"ڈاکٹر کہتے ہیں۔ اسے ابھی زندہ رہنا ہے۔ زندگی کا سکھ اٹھانا ہے۔"

"اب کیا اٹھائے گی۔ وہ سکھ، دکھ جھیلتے جھیلتے اس کی جان پہ بن گئی۔ ان حالوں کو پہنچ گئی۔ دیکھیں (ٹھنڈی سانس لے کر) خدا کی کیا مرضی ہے!"

"آخر اسے دکھ کیا ہے؟ آزار کیا ہے؟ فکر کیا ہے؟"

"یہی تو وہ نہیں کھلتیں۔ بس گھلی جا رہی ہیں!"

"تم اسے کیوں نہ لے آئے یہاں؟"

"کہا تو تھا میں نے۔"

"پھر؟"

"انھوں نے کہا۔ تم ہاشم کو یہاں لے آؤ۔ میں اس کی خدمت کروں گی۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟"

"بیٹا! میں جھوٹ کیوں بولنے لگا۔"

ہاشم پر پھر دل کا دورہ پڑا۔ نرس نے اسے لٹا دیا۔ ہاشم نے آنکھیں کھولیں۔ منشی جی سے لیٹے لیٹے کہا۔

"آ گیا وہ وقت جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ میری وصیت سن لو۔ اور جلدی سے میرے دستخط لے لو۔"

منشی جی پھر رونے لگے۔ ہاشم نے کہا۔

"رونے کا وقت پھر بھی مل سکے گا۔ لیکن میرے دستخط تم پھر نہ کرا سکو گے۔"

ہاشم بولتا گیا اور منشی جی لکھتے گئے۔

"میری لاش یہاں نہ دفن کی جائے۔ وطن لے جائی جائے۔ وہیں اس کی تدفین کی جائے۔ میرا زر نقد اور جائداد کملا اور رضیہ میں برابر تقسیم کر دیا جائے۔ منشی جی کو زندگی بھر دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا رہے۔"

منشی جی نے روتے ہوئے کاغذ ہاشم کی طرف بڑھایا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس پر دستخط کیے۔ ڈاکٹر کو نرس نے پہلے ہی بلا لیا۔ وہ مع اپنے دو اسسٹنٹوں کے آن موجود ہوا تھا۔ وصیت نامہ پر انہی لوگوں نے گواہ کی حیثیت سے دستخط کیے۔ منشی جی کو قلم واپس کرتے کرتے ہاشم نے جلدی سے ایک بے کلی کے ساتھ سینہ پر ہاتھ رکھا۔ گردن جھک گئی۔ آنکھیں پھر گئیں۔ منکا ڈھل گیا۔

ڈاکٹر نے فیصلہ کر دیا۔ موت ہو گئی۔ کملا بے ہوش ہو گئی۔ منشی جی پچھاڑیں کھانے لگے۔ نرس نے آہستہ سے چادر اٹھائی اور اس بے غرار مجسمہ کو ڈھانپ دیا۔ جو ابھی چند سیکنڈ پہلے تک دل کے ہاتھوں تہ و بالا ہو رہا تھا۔ کمرہ پر عجیب گمگی سی چھائی تھی۔ ڈاکٹر گردن جھکائے اور اس کے اسسٹنٹ ہاتھ میں ہینڈ بیگ لیے چپ چاپ کھڑے تھے۔

لاش برف میں رکھ دی گئی۔ اور منشی جی روتے سینہ پیٹتے کملا کے ساتھ ہاشم کی لاش لے کر پہلی ٹرین سے روانہ ہو گئے۔ کملا اب ہوش میں آ گئی تھی اور بڑے ضبط کا ثبوت دے رہی تھی۔ وہ اپنے تئیں سنبھالے ہوئے تھی اور منشی جی کو بھی سنبھال رہی تھی۔

منشی جی نے روانہ ہوتے وقت تار دے دیا تھا اسٹیشن پر ایک بڑا مجمع دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کا اس جواں مرگ کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ دوست، دشمن، اپنے پرائے سب رو رہے تھے۔ پہلے ہی سے ٹیس پڑی ہوئی تھی۔ گھر میں لاش آئی۔ تو قیامت برپا ہو گئی۔ کوئی ایسا نہ تھا جو رو نہ رہا ہو جس کی آنکھوں سے آنسو نہ جاری ہوں۔ رضیہ کو کملا سنبھالے ہوئے تھی۔ لیکن اس پر بار بار بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

یہ اطلاع شاکر کے گھر بھی پہنچی۔ امی جان کچھ علیل تھیں نہ جا سکیں، منصور اور ثریا جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ "چلئے" چلتے چلتے منصور نے شاکر سے کہا۔

"چلئے آپ بھی چلئے!"

"مجھے فرصت نہیں ہے!"

"بُری بات ہے"

"تم تو جا رہے ہو۔ بس کافی ہے یہ!"

"آپ کا جانا میرے جانے سے زیادہ ضروری ہے!"

"میں نہیں جاؤں گا"

منصور خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے ثریا کو ساتھ لیا اور رضیہ کے گھر پہنچا۔ گھر میں حشر بپا ہو رہا تھا۔ ہاشم کی خالہ اور رضیہ کی ماں روتے روتے دیوانی ہو گئی تھیں۔ انہیں ہاشم سے بہت کم محبت تھی۔ انہی کی تربیت میں وہ پلا اور بڑھا تھا۔ منصور جب پہنچا تو ہاشم کی لاش آخری دیدار کے لئے بے زنان خانہ میں پہنچا دی

منصور افتاں و خیزاں گھر پہنچا۔ امی جان مصلّے پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھیں۔ اور شاکر اچکن پہن کر یاسمین کے ہاں جا رہا تھا۔ شاکر نے اس گھبرائی ہوئی حالت میں اسے دیکھا اور کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"بھائی جان کا انتقال ہو گیا!"

اماں نے دعا چھوڑ دی۔ دوڑی ہوئی آئیں۔

"تیرے منہ میں خاک کیا بک رہا ہے؟"

"امی جان! بھائی جان گذر گئیں"

شاکر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جس پرند کو اس نے پنجرہ میں بند کر رکھا تھا وہ آج اتنے زور سے پھڑپھڑایا۔ کہ تیلیاں ٹوٹ گئیں اور وہ اڑ گیا۔

شاکر کا گھر بھی ماتم کدہ بن گیا۔ منصور نے سر کے بال نوچ لئے۔ شاکر نے گریبان پھاڑ لیا۔ امی جان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہ نکلی۔ گھر کے نوکر چاکر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ رضیہ مر جائے۔ اس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ لیکن وہ وہم و گمان واقعہ بن گیا۔ اٹل۔ ناقابلِ تردید!

امی جان، منصور، شاکر جب رضیہ کے ہاں پہنچے۔ تو اس کا جنازہ بھی تیار ہو چکا تھا۔ ایک چارپائی پر ہاشم ہمیشگی کی نیند سو رہا تھا۔ دوسری چارپائی پر کافور و عود میں بسی ہوئی رضیہ لیٹی تھی۔ ایسی میٹھی نیند سو رہی تھی۔ کہ گھر کے یہ ہنگامے اس میں ذرا بھی خلل انداز نہیں ہوتے تھے!

منصور افتاں خیزاں گھر پہنچا۔ امی جان مصلّے پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھیں۔ اور شاکر اچکن پہن کر یاسمین کے ہاں جا رہا تھا۔ شاکر نے اس گھبرائی ہوئی حالت میں اسے دیکھا اور کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"بھائی جان کا انتقال ہوگیا۔"

اماں نے دعا چھوڑ دی۔ دوڑی ہوئی آئیں۔

"تیرے منہ میں خاک کیا بک رہا ہے؟"

"امی جان! بھابی جان گذر گئیں"

شاکر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جس پرندے کو اس نے پنجرہ میں بند کر رکھا تھا، وہ آج اتنے زور سے پھڑپھڑایا۔ کہ تیلیاں ٹوٹ گئیں۔ اور وہ اڑ گیا۔

شاکر کا گھر بھی ماتم کدہ بن گیا۔ منصور نے سر کے بال نوچ لئے۔ شاکر نے گریبان پھاڑ لیا۔ امی جان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہ نکلی۔ گھر کے نوکر چاکر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ رضیہ مر جائے۔ اس کا کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا۔ لیکن وہ وہم وگمان واقعہ بن گیا۔ اٹل۔ ناقابل تردید!

امی جان، منصور۔ شاکر جب رضیہ کے ہاں پہنچے۔ تو اس کا جنازہ بھی تیار ہو چکا تھا۔ ایک چارپائی پر ہاشم ہمیشگی کی نیند سو رہا تھا۔ دوسری چارپائی پر کافور اور عود میں بسی ہوئی رضیہ لیٹی تھی۔ ایسی میٹھی نیند سو رہی تھی۔ کہ گھر کے یہ ہنگامے اس پر ذرا بھی خلل انداز نہیں ہوتے تھے!

اب رضیہ کا آخری دیدار شروع ہوا۔ سب سے آخر میں شاکر کی باری آئی۔ وہ آگے بڑھا۔ لیکن اس کے دل نے اسے ڈانٹا۔ خبردار! تو نامحرم ہے۔ ناپاک ہے تیری ناپاک آنکھیں رضیہ کے مقدس چہرہ پر نہیں پڑ سکتیں۔ اس نور مجسم کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اس پاکیزگی تمثال کو قریب بھی تجھے جانے کی ہمت نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ رک گیا۔ اس کے قدم وہیں جم گئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ثریا آئی۔ اس نے کہا۔ "بھائی جان چلئے دیدار کر لیجئے!"

شاکر نے کہا۔ نہیں ثریا مجھ میں اتنی تاب نہیں ہے۔ میں رضیہ کا چہرہ نہیں دیکھ سکوں گا۔ لوگوں سے کہو جنازہ اٹھائیں!

ثریا روتی ہوئی چلی گئی۔ ایک شور قیامت کے ساتھ ہاشم اور رضیہ کے جنازے ساتھ ساتھ اٹھے۔ یہ دونوں زندگی بھر ایک دوسرے کے قریب نہ پہنچ سکے۔ لیکن اب دوش بدوش سفر حیات کی آخری منزل طے کر رہے تھے۔

اب رضیہ کا آخری دیدار ضروری تھا۔ سب سے آخر میں شاکر کی باری آئی۔ وہ آگے بڑھا۔ لیکن اس کے دل نے اسے ڈانٹا۔ خبردار! تو نامحرم ہے۔ ناپاک ہے تیری ناپاک آنکھیں رضیہ کے مقدس چہرہ پر نہیں پڑ سکتیں۔ اس نورِ مجسم کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اس پاکیزگی تمثال کے قریب بھی تجھے جانے کی ہمت نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ رُک گیا۔ اس کے قدم وہیں جم گئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ثریا آئی۔ اس نے کہا۔ "بھائی جان چلئے دیدار کر لیجئے!"

شاکر نے کہا۔ نہیں ثریا مجھ میں اتنی تاب نہیں ہے۔ میں رضیہ کا چہرہ نہیں دیکھ سکوں گا۔ لوگوں سے کہو جنازہ اٹھائیں!

ثریا روتی ہوئی چلی گئی۔ ایک شورِ قیامت کے ساتھ ہاشم اور رضیہ کے جنازے ساتھ ساتھ اٹھے۔ یہ دونوں زندگی بھر ایک دوسرے کے قریب نہ پہنچ سکے۔ لیکن اب دوش بدوش سفرِ حیات کی آخری منزل طے کر رہے تھے۔

باب ۴۰

پاگل

آج رضیہ کا سوئم تھا۔ گھر بھر شریک ہوا تھا۔ اس میں شاکر بھی موجود تھا۔ جملہ حاضرین پر رنج و غم کی کیفیت طاری تھی۔

دفعتہً اس سوگوار محفل میں فلک شگاف قہقہوں کی آواز بلند ہونے لگی۔ سب نے حیرت کے ساتھ دیکھا۔ ایک دیوانگی کی ادا کے ساتھ شاکر ہنس رہا ہے۔ منصور نے بڑھ کر اسے ٹوکا۔

"بھائی جان! یہ کیا؟"

"ہاشم کی بے وقوفی پر ہنس رہا ہوں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں بھئی دیکھو نا اغوا کر لے گیا رضیہ کو!"

یہ کہہ کر پھر اس نے ایک فلک رس قہقہہ لگایا۔ اور اٹھ کے ناچنے لگا۔ کہنے لگا۔ خوب جلاؤں گا ان دونوں کو۔ وہ دونوں آسمان کی ساتھ ساتھ سیر کر رہے ہوں گے۔ چلیں ہو رہی ہوں گی۔ رضیہ گا رہی ہوگی۔ وہ مست ہو ہو کر سن رہا ہوگا میں بھی ناچوں گا۔ ان پہ ثابت کر دوں گا۔ مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ میں خوش ہوں۔ ناچ رہا ہوں۔ گا رہا ہوں۔ موج اڑا رہا ہوں۔ ہی ہی ہا ہا۔

اس کے قہقہے سن سن کر۔ اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر منصور نے کہا۔

"اپنے تئیں سنبھالئے بھائی جان"

سنبھالوں۔ تو کیا میں ناچ کے جھونک میں گرا پڑا ہوں۔ تم جھوٹے ہو۔ میں نہیں گر سکتا۔ شرابی گرتے ہیں۔ میں نے بھی شراب نہیں پی۔ سنا ہے ہاشم تھا شراب کا رسیا وہ دیکھو دھماکا ہوا۔ آسمان سے لڑھکتا ہوا چلا آ رہا ہے ہاشم دیکھنا خبر لینا بے چارے کا کہیں سر نہ پھوٹ جائے۔ وہ دیکھو پیچھے پیچھے رضیہ بھی چلی آ رہی ہے۔ کس شان سے آ رہی ہے۔ مجھے جلانے آ رہی ہے۔ میرا منہ چڑا رہی ہے۔ مجھ سے کہہ رہی ہے کہ تو میرا کچھ۔ اب تو تم کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے میرا۔ میں شاکر ہوں۔ میں بگاڑ کے دکھا دوں گا ان دونوں کو۔

یہ کہہ کر شاکر دیوانوں کی طرح منصور کی طرف بڑھا اور اسے ہاشم یقین کر کے اس کا گلا پکڑ لیا۔

لوگ دوڑ پڑے۔ منصور اور شاکر کو الگ کیا۔ سب نے متفقہ فیصلہ کر دیا۔

پاگل ہو گیا ہے شاکر۔

بڑی مشکل سے اس پر قابو پایا گیا۔ گھر لائے اسے اور زنجیروں سے جکڑ دیا۔ وہ اب گالیاں بک رہا تھا۔ مارنے کو دوڑتا تھا۔ کھانا پھینک دیتا تھا۔ پیشاب کو شربت کہہ کر گلاس میں انڈیل کر پینے لگتا تھا۔ زنجیر سے کھیلا کرتا۔ اپنا سر لہولہان کر لیتا۔ پھر بھی ہنستا رہتا۔ زنجیر کھڑکاتا۔ بچوں کو جمع کر لیتا۔ کہتا۔ باجہ سنو بھئی۔ یہ کہہ کر پھر زنجیر کو پٹخنے لگتا۔

منصور نے بڑی تندہی سے شاکر کا علاج کیا۔ لیکن
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کوئی دوا کارگر نہیں ہوئی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی اسے پاگل خانہ بھیج دیا جائے لیکن امی جان پاگل خانہ کا نام سن کر کانوں پہ انگلیاں دھرنے لگتی تھیں۔ جتنا روپیہ بھی خرچ ہو۔ یہیں علاج کرو۔ پاگل خانے تو میں اسے جانے نہیں دوں گی۔ وہاں چار چوٹ کی مار پڑتی ہے پاگلوں پر۔ میں نے تو شاکر کو کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگتیں۔ اور منصور خاموش ہو جاتا۔

زہرہ کو شاہدہ کے ذریعہ اس گھر کی دم بدم کی خبریں مل رہی تھیں۔ شروع شروع میں اس نے شاکر کی دیوانگی کا حال سنا۔ تو سمجھی وقتی اثر ہے۔ اتنا بڑا صدمہ نہ سہہ سکے۔ ٹھیک ہو جائیں گے دو چار دن میں۔ لیکن جب یہ خبریں ملنے لگیں کہ اس کی دیوانگی بڑھتی جاتی ہے تو اسے تشویش دامنگیر ہوئی۔ وہ اب ہر وقت گم صم سی رہتی نہ کسی سے بات کرتی۔ نہ گاتی۔ نہ ناچتی۔ اس نے یہ سب کام یک لخت ترک کر دیئے تھے۔ بڑی بی بھی راضی برضا تھیں۔ وہ زہرہ کے لئے روپیہ جمع کرنا چاہتی تھیں

اور اب اس کے پاس روپیہ کی کمی نہیں کھلی۔ شاہد جب اسے شاکر کی خبر سناتا۔ وہ بدحواس ہو کر رونے لگتی۔

ایک روز اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر شاہد سے کہا۔

"میرا ایک کام کر دو گے"؟

"جو کہو"

"یا تو شاکر کو یہاں پہنچا دو۔ یا مجھے اس کے پاس لے چلو۔ اس کی دیکھ بھال صرف میں کر سکتی ہوں۔ اگر یہ نہ ہوا تو یا تو میں بھی پاگل ہو جاؤں گی یا دیکھ لینا کسی دن بیٹھے بیٹھے جان دے دوں گی"۔

شاہد نے بڑی محبت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ کر کہا۔

"کیوں؟ چاہتی ہو انہیں"؟

"باتوں کا یہ وقت نہیں ہے کام کا ہے"۔

"اچھا میں کوشش کرونگا"

شاہد گھر گیا۔ اس نے ثریا سے آج کی باتیں کہیں۔ ثریا نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا۔ ٹھہرو میں اماں سے کہتی ہوں۔

امی جان کو ثریا نے شیشے میں اتار رکھا تھا۔ کچھ اس طرح فرمائش کی کہ وہ ٹال نہ سکیں۔ اُنہوں نے زہرہ کو آنے کی اجازت دے دی۔

پہلے پہل اس گھر میں ایک پاگل کی دیکھ بھال کے لئے زہرہ داخل ہوئی۔ اس نے شاکر کو دیکھا۔ شاکر نے اسے دیکھا۔ اس نے گردن جھکا لی۔

زہرہ اس کے پاس گئی۔ اس سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے کہا۔

"زہرہ! تم یہاں کہاں"؟

"آگئی تمہیں دیکھنے"۔

"کیا میں کوئی تماشہ ہوں"؟

"نہیں دوست"

"نہیں عاشق صادق"

"اچھا یہی سہی"

"اچھا نہیں اقرار کرو"

"اقرار کرتی ہوں"

"تم مجھ سے شادی کرو گی"؟

"کر لوں گی"

"کب"؟

"جب تم اچھے ہو جاؤ گے"

"تو کیا میں بیمار ہوں؟ ہٹ۔ پگلی کہیں کی" یہ کہہ کر وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا۔

شاکر کا جنون شباب پر تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ ماں کی نقلیں اتارا کرتا تھا۔ دیکھو۔ اس بڈھی کھوسٹ کو قیامت کے بودے سمیٹ رہی ہے۔ مرتی بھی نہیں۔ ثریا کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ شاہد کی صورت دیکھتے ہی بندر کی طرح چار پاؤں پر چلنے لگتا۔ اور فوں فوں کر کے لپکتا اس کی طرف منصور کو دیکھ

کر وہ پاگل ہو جاتا۔ کہتا مار ڈالوں گا اس حرام خور کو۔ یہ چوٹٹا ہے بدمعاش ہے کمینہ ہے۔ لیکن زہرہ کو دیکھ کر اس کا جوش جنون کم ہو جاتا تھا۔ وہ آدمیوں کی سی باتیں کرنے لگتا تھا۔ کم از کم اس کے جوش جنون میں کمی ہو جاتی تھی۔

ڈاکٹروں کی یہ رائے ہوئی۔ کہ شاکر کو اس گھر کے علاوہ کسی اور گھر میں رکھا جائے۔ یہاں کے سب لوگوں سے وہ بھڑکتا ہے۔ انہیں دیکھ دیکھ کر اس کا جوش جنون بڑھتا ہے۔ ان لوگوں سے ہٹ کر اگر وہ دوسری جگہ رہے گا تو رفتہ رفتہ اس کے جنون میں خاصی کمی آجائے گی۔"

بات معقول تھی۔ سب نے مان لی۔ زہرہ شاکر کو اپنے گھر لے آئی۔ یہاں نسبتاً اس کی صحت اعتدال پر تھی۔ دیوانگی کے دورے پڑتے رہتے تھے دیوانگی کی حرکتیں کرتا تھا۔ لیکن بہت کم۔ زہرہ جو ایک عرصہ تک اس کی زندگی پر حکمرانی کر چکی تھی۔ ایک بار پھر اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی ملاطفت اور پیار کے برتاؤ نے اس دیوانے کو رام کر لیا تھا۔

اب بھی شاکر کے سامنے امی جان۔ ثریا۔ رضیہ۔ شاہد منصور کا نام لینا۔ دیوانہ را ہوئے بس است! کا مصداق تھا۔

ان میں سے کسی کا نام وہ سن لے بس پھر نہ زنجیریں اسے روک سکیں گی۔ نہ دوائیں۔ پھر وہ قابو میں نہیں رہتا تھا۔ مگر زہرہ اسے بس میں کئے ہوئے تھی۔ ان لوگوں کا ذکر بھی اس کے سامنے نہیں ہونے دیتی تھی۔ اگر کبھی کوئی بات نکل پڑتی۔ تو شاکر سے زیادہ شاہد تک کو وہ گالیاں دینے لگتی۔ زہرہ کی یہ وفاداری اور ہم خیالی دیکھ کر اس کا جنون پھر کم ہو جاتا۔ پھر وہ زہرہ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگتا۔ زہرہ اس کی رگ پہچان گئی تھی۔ اور ایک ہوشیار طبیب کی طرح

کا علاج کر رہی تھی۔

شاکر کی تیمارداری میں زہرہ نے اپنے تئیں ستی کر دیا تھا۔ اس کا وہ بالاخانہ جو رشک ارم تھا اب وہاں الو بول رہا تھا۔ اس نے اپنی دکان اٹھا دی تھی۔ اب وہاں کوئی جھانکتا بھی نہیں تھا۔ پورے انہماک پورے استغراق اور پوری محویت کے ساتھ وہ شاکر کو سنبھال رہی تھی۔ اس کے پاگل دل کو میٹھے میٹھے بولوں سے قرار میں لا رہی تھی۔

زہرہ کی یہ خواہش تھی۔ کہ عارف کو بھی اپنے پاس بلالے۔ لیکن اس کے ننھیال والوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ عارف کو ہرگز شاکر یا اس کے کسی عزیز کے سپرد نہیں کرینگے۔ کملا اس کی اتالیق تھی۔ اس نے بڑی آسانی سے رضیہ کی جگہ لے لی۔ اس ریاضت کے ساتھ وہ عارف کی عبادت کرتی تھی۔ جیسے کوئی بڑا عقیدت مند کسی مورتی کو پوجتا ہو۔ وہ عارف میں رضیہ کی جھلک دیکھتی تھی۔ اور رضیہ کا خیال آتے ہی نہ جانے کیوں ہاشم یاد آجاتا تھا۔ وہ چمک کر اٹھتی تھی۔ اور عارف کو کلیجے سے لگا لیتی تھی۔

منشی جی نے حسب وصیت ہاشم کی آدھی جائداد کا قبالہ عارف (اب رضیہ کا وہی تنہا وارث تھا) کے نام اور آدھا کملا کے نام تیار کیا۔ کملا کو معلوم ہوا تو وہ بہت بگڑی۔ اس نے کہا۔ عارف میرا بیٹا ہے۔ یہ قبالہ بھی اسی کے نام منتقل کرا دو۔ جب تک اس خدا کی بندی نے ساری جائداد عارف کے نام نہ منتقل کرا دی کھانا تک نہیں کھایا گیا اس سے۔

رضیہ کی ماں اولاد سے بھی زیادہ کملا کو چاہتی تھی۔ پھر وہ عارف پر جس طرح صدقے قربان ہو رہی تھی۔ اس نے تو اور زیادہ ان کے دل میں اس کی جگہ پیدا کر دی

تھی۔ کملا اس وقت تک چپ چاپ اداس اداس رہتی تھی۔ جب تک وہ اسکول میں رہتا تھا۔ وہاں سے وہ واپس آیا۔ اور وہ پھول کی طرح کھل اٹھی۔ اب اس سے زیادہ خوش سارے گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اس چاؤ پیار سے وہ عارف کا ناشتہ تیار کرتی۔ اسے نہلاتی دھلاتی۔ اس کے کپڑے بدلواتی۔ اس کا بستر ٹھیک کرتی۔ اسے اپنے سامنے بٹھاکر پڑھاتی۔ کہ لوگ یہ تماشا دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ ایسی عورت کاہے کو کسی نے دیکھی ہوگی دنیا میں۔"

باب ۱۴

باغی کون؟

منصور کی حضوری کے ساتھ اور ثریا کی شادی کے ساتھ امی جان کی سرپرستی میں بڑے سکھ اور چین سے بسر ہو رہی تھی۔ ان کی زندگی کے چمنستان میں پھول ہی پھول تھے۔ کلیاں ہی کلیاں تھیں۔ تبسم تھا۔ ہنسی تھی۔ قہقہے تھے۔ البتہ شاکر اور دیوکی اس سدا بہار گلشن میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ کچھ جی تھا۔ شاکر ثریا اور منصور کا بھائی تھا۔ قدرتاً اس کی مجنونانہ حرکتیں دیکھ دیکھ کر ان سب کے دل کڑھتے تھے۔ زندگی کا چاند پریشانی کے بادلوں میں تھوڑی دیر کے لئے چھپ جایا کرتا تھا۔ اس کے علاج پر پانی کی طرح روپیہ صرف ہوا۔ لیکن اب تک حالت میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ یہ دونوں بھائی بہن اب زہرہ کی شرافت اور پاکبازی کے زیادہ قائل ہو گئے تھے۔ کس بے غرضی۔ کس بے لوثی اور کس فدائیت کے

جذبہ سے وہ اپنا تن من دھن شاکر جیسے دیوانے پر قربان کئے دے رہی تھی۔ وہ شاکر کی ہوس رانیوں کے آگے سر نہ جھکا سکی۔ اس کے سیم و زر کے بند حلقوں میں نہ بندھ سکی۔ وہ اس کی بوالہوسی پر ہمیشہ پیچ و تاب کھاتی رہی۔ وہ کبھی بھی اس کی نہ بن سکی۔ لیکن اس کی دیوانگی نے زہرہ کی محبت کے سوئے ہوئے تاروں کو بیدار کر دیا۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھی۔ اس نے دنیا پر لات مار دی۔ اور اسی کی ہو رہی

ایک روز شب کے کھانے کے بعد باتیں چھڑ گئیں۔ بھائی بہن میں اس مجمع میں صنوبر بھی اپنے بچے کو لئے ہوئے موجود تھی اور شاہد بھی بیٹھا تھا۔ منصور نے ثریا سے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"حیرت ہوتی ہے"

"کاہے پر"

"محبت بھی اپنا نشیمن کہاں کہاں بنا لیتی ہے!"

"ہاں ہے تو سچ۔ دیکھئے نا بھائی جان کی محبت میں اس ہستی نے زندگی کی ہر راحت چھوڑ دی۔ جس نے اسے ٹھکرا دیا تھا"

"یہ کیسے پیدا ہو جاتی ہے؟ دل کے کس کس گوشہ میں پناہ لیتی ہے؟ کیونکر اپنے پاؤں جماتی اور پروان چڑھتی ہے۔ اس کے بارے میں ہر فلسفی ہر ماہر نفسیات کچھ نہیں بتا سکتا۔ بتایا بھی ہے تو اٹکل پچو!"

"یہ وہ راز ہے جس کی امین خود قدرت ہے۔ اگر یہ بے نقاب ہو جائے تو یہ کائنات زیر و زبر ہو جائے"

"ہماری سماج بھی تو ایک راز ہے"

(مسکرا کر) "ہاں۔ لیکن کھلا ہوا راز"

"خوب بات کہی ثریا تم نے۔ واقعی ہماری سماج ایک کھلا ہوا راز ہے۔ اس کی فطرت اگرچہ گوناگوں خصائل رکھتی ہے۔ لیکن بے نقاب ہے"

"اور کیا دیکھ لیجئے۔ یہی سماج تھی جو میری اور آپ کی دشمن تھی۔ جان کی گاہک تھی۔ خون کی پیاسی تھی۔ لیکن ہم ڈٹ گئے اس کے مقابلہ میں۔ کوئی پروا نہ کی ہم نے اس کی چیخ کی۔ اور اب وہی سماج ہے جو ہماری قدردان ہے۔ ہماری بغاوت کو سراہتی ہے۔ ہماری سرکشی پر عقیدت کے پھول چڑھاتی ہے"

"سچ کہتی ہو۔ جو ہمارے سایہ سے بھڑکتے تھے۔ اب ہمارے زیر سایہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں!"

سب لوگ ہنسنے لگے۔ منصور نے کہا۔

"میں غلط نہیں کہتا ہوں۔ وہی صنوبر کو لونڈی کا طعنہ دینے والی بیبیاں اسے شادی بیاہ میں بلاتی ہیں۔ اس کی عزت کرتی ہیں۔ اسے اپنے ساتھ کھانے کھلاتی ہیں۔ بار بار اس کی خیریت مزاج دریافت کرتی ہیں"

صنوبر خود آج بڑے مزے لے لے کر "تو اب رخصت دلہن کے ہاں کی تقریب کا ذکر کر رہی تھی۔ یاد ہوگا۔ یہ وہی رخصت دلہن ہیں جنہوں نے امی جان کو سندیسہ بھیجا تھا۔ کہ اگر صنوبر منصور کے گھر پڑی رہی تو حقہ پانی بند تمہارا"

"حقہ پانی" کے لفظ پر سب نے لطف لیا۔

ثریا بولی۔

"یہی حال لوگوں کا شاہد کے ساتھ ہے۔ کیا کچھ نہ کیا گیا (اشارہ کر کے) ان کے بارے میں لیکن جب یہ بن گئے۔ اس گھر کے رکن۔ اور سمجھ لیا لوگوں نے کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب دیکھ رہی ہیں۔ جو ہر جگہ بلائے جاتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے

ہیں؟

"ابھی کیا ہے۔ اگر زندہ ہوں تو ثریا تجھے دکھا دوں گا کسی شریف خاندان سے افضال (منصور کا لڑکا) کا بیاہ کر کے یہی لوگ جو آج میل ملاپ کے باوجود حسب نسب کے شجرے لے کر بیٹھے ہوتے ان کی تلاوت بڑے خضوع خشوع سے کر رہے ہیں۔ خود اشاروں اشاروں میں کہیں گے۔ بنا دو افضال کو ہمارا داماد!"

کچھ دیر منصور خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"سماج کے ان ٹھیکہ داروں کو یہ پیسہ چاہیئے۔ اگر افضال کہیں بدقسمتی سے غریب ہوتا۔ تو واقعی اس کی زندگی مشکل تھی۔ لیکن اگر وہ امیر ہے۔ دولت مند ہے۔ تو اس کا ہر عیب ہنر بن جائے گا۔ سماج کا احتجاج اس کی نفرت اس کی بیگانگی سب کا خاتمہ ہو جائے گا!

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

"یہی صنوبر جو آج تک بہت سی نظروں میں لونڈی ہے ہر ذلت کی مستحق ہے اور کسی عزت کی سزاوار نہیں۔ یہ اگر کسی طرح مرد بن جائے اور تعلیم حاصل کر کے آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھے اور کامیاب ہو جائے اور پھر اسی شہر میں ڈپٹی کمشنر بن کر آ جائے۔ تو ہمارے نسب پرست سماج کی لڑکیاں دھکیل دھکیل کر بھیجی جائیں گی اس کے پاس!"

ثریا ہنسنے لگی۔ صنوبر نے کہا۔

"نہیں یہ باتیں نہیں اچھی لگتیں۔ میں کیوں مرد بن جاؤں۔ تم نہ بن جاؤ عورت!"

منصور نے زور کا ایک قہقہہ لگایا۔

ثریا نے کہا۔

"ہاں بھیا کہتے تو ٹھیک ہو۔ خوب یاد آیا مجھے کل ہی کی تو بات ہے ڈپٹی صاحب کی بیوی آئی تھیں۔ یہاں بڑی دیر تک رہیں۔ افضال پر تو صدقے قربان ہوتی جا رہی تھیں۔ بار بار اس کی بلائیں لیتی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی لڑکی بھی تھی۔ بالکل ننھی سی معلوم ہوتی تھی۔ چینی کی گڑیا۔ کہنے لگیں۔ اس کا اور افضال کا سنگم کتنا اچھا لگتا ہے۔ وہ تو امی جان نے بات کاٹ دی ورنہ میرا خیال ہے اگر ہم میں سے کوئی زور دیتا۔ تو اس شیر خوارگی کے عالم میں بھی اس کا بیاہ افضال سے کرنے پر وہ تیار ہو جاتیں۔"

منصور پھر ہنسنے لگا۔ آج وہ موج میں تھا۔ جب اس کی طبیعت رنگ پر ہوتی تھی۔ تو بات بات پہ ہنسنے لگتا تھا۔

کچھ دیر تک مجمع پر خاموشی سی رہی۔ پھر منصور نے کہا۔

"بھابی کی یاد اکثر آتی رہتی ہے۔ ان کی موت میرے دل پر ایک ایسا نقش ہے جو زخم بنا چلا جا رہا ہے۔ مجھے بڑی شرم آتی ہے کہ میری وجہ سے انہیں کافی ذہنی اور دماغی تکلیف پہنچی۔"

"ہاں بھیا تم نے انہیں بہت دق کیا۔ وہ تمہیں بالکل نہیں چاہتی تھیں انہیں تو ہاشم سے محبت تھی۔ وہ ان کے مرنے سے پہلے کی باتیں ابھی نہیں بھول سکتی۔ یاد کرتی ہوں تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کا ہاشم کی پیشانی کو چومنا وہ ان کا اس کے تلووں سے آنکھیں ملنا اور آنکھیں ملتے ملتے جان بحق ہو جانا میری زندگی کا سب سے بڑا غم انگیز سانحہ ہے۔"

اور ثریا میرا بھی یہی اگر یہ جانتا۔ تو کبھی ان کا دل نہ دکھاتا۔ اس کرہ ارض کی

عورتیں جس کا نمونہ بھابی تھیں چشمِ فلک نے کم دیکھی ہوں گی۔"

"اور کملا"؟

کملا اور زہرہ سب میں کردار ہے۔ لیکن وہ بھابی کی سی بات کہاں۔ کچھ سہل ہے۔ اس طرح زندگی بسر کر لینا جس طرح وہ بسر کر گئیں؟ میرے دل میں جو امی جان کی عزت و حرمت ہے۔ وہ کسی عورت کی نہیں ہے۔ لیکن ثریا میرا خیال ہے۔ اگر اماں بھی بھابی کی جگہ ہوتیں۔ تو ان کے پاؤں ڈگمگا جاتے۔ وہ عورت تھی ہی نہیں ——— چٹان ——— پہاڑ! ترغیب کی آندھیاں چلیں۔ جذبات کے طوفان اٹھے۔ شوہر کی بے پروائی۔ تغافل اور بے رخی کے بادل چھائے۔ لیکن پہاڑ اپنی جگہ قائم تھا۔ چٹان وہیں کی وہیں موجود تھی۔ اللہ اکبر!"

آخر وقت تک انہوں نے یہ راز نہیں ظاہر ہونے دیا کہ ان کے دل میں بھائی جان کے علاوہ کوئی اور بسا ہوا ہے؟ حد ہو گئی ضبط کی!

"اور کیسا ضبط؟ دل میں جوالا مکھی پھٹی پڑ رہی ہے۔ لیکن کیا مجال جو دھواں بھی باہر آجائے۔ سینہ محبت کا گنجینہ بنا ہوا ہے۔ لیکن کیا مجال جو قدم ڈگمگا جائیں۔ محبوب کو معتوب اور معتوب کو محبوب بنا لینا اور اف نہ کرنا انہی کا کام تھا۔ یہ وہی کر سکتی تھیں!"

یاس عورت کو بہت جلد ورغلایا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ان کی یاس بڑھتی گئی۔ ان کے استقلال اور عزیمت کا سورج اور اونچا ہوتا گیا۔

ثریا! لوگ کہتے ہیں۔ ہم باغی ہیں۔ ہم نے سماج کے آئین کے خلاف اس کے بنائے ہوئے ضابطے کے خلاف اس کے قائم کئے ہوئے رسم و رواج کے خلاف اس کے دستور اور اصول کے خلاف بغاوت کی۔ مخالفوں کے بڑے سے بڑے

طوفان میں بھی ہمارے پائے ثبوتِ لغزش سے محفوظ رہے۔ ہم نے سماج کو شکست دے دی۔ اسے ہار ماننی پڑی۔ اور ہم جیت گئے۔"

منصور کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ ذرا کے ذرا چپ ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"لیکن ہماری بغاوت کچھ نہیں تھی۔ اصلی باغی تھیں رضیہ!"

"یہ کیا کہنے لگے بھیا۔ انہوں نے بے چاری نے کون سی بغاوت کی۔ وہ تو گھٹ گھٹ کے زندہ رہیں اور گھٹ گھٹ کے مر گئیں۔ ان میں بغاوت کرنے کا حوصلہ ہی نہیں تھا ——— حوصلہ ہوتا۔ تو آ جاتیں وہ بھی ہماری صف میں۔ بھائی جان سے بغاوت کرتیں۔ اور کھلے بندوں ہاشم کی ہو رہتیں۔ کچھ بھی کرتی سماج۔ لوگ گھروں سے ڈنڈے لے لے کر نکل آتے۔ لیکن پورے استقلال کے ساتھ وہ سب کا مقابلہ کرتیں۔ آخر ہم نے کیا کیا نہیں؟ کامیاب ہوئے یا نہیں؟ ضرور وہ بھی کامیاب ہوتیں۔ اور آج ہم ان کی جوانمرگی کا۔ ان کی بے بسی کا۔ ان کی دلدوز موت کا ماتم نہ کر رہے ہوتے۔ بلکہ اپنی طرح انہیں بھی خوش و خرم، مسرور و مطمئن، بے فکر اور بے پروا پاتے۔ لیکن وہ حوصلہ ہار گئیں۔ اور آخر اپنی جان کھو بیٹھیں!"

"مجھے تم سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔ جو بغاوت وہ کر گئیں۔ وہ کوئی نہیں کر سکتا۔ باغیوں کی صف میں سب سے پہلا درجہ ان کا ہے۔"

"ہماری سمجھ میں نہیں آتا بھیا!"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ حکومت کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے۔ سماج کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے۔ دنیا کے ہر نظام کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے

لیکن ——— دل کے خلاف بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ بے شک ہم نے سماج کے خلاف بغاوت کی ——— لیکن کب؟ جب دل کے آگے ہم ہتھیار ڈال چکے تھے۔ ہم ایسے فاتح ہیں۔ جو پہلے شکست کھا چکا تھا۔ مگر انہوں نے دل کے سامنے بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ انہوں نے بغاوت کی دل کے خلاف بہتے ہوئے آنسوؤں کے خلاف۔ گھٹتی ہوئی آہوں کے خلاف۔ امڈتے ہوئے جذبات کے خلاف۔ دل نے ان پر حملہ کیا۔ اور وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح لڑتی رہیں۔ آنسوؤں نے انہیں زیر کرنا چاہا۔ لیکن ایک آنسو بھی انہوں نے اپنی آنکھ سے نہیں ٹپکنے دیا۔ آہیں مچلیں ——— لیکن انہوں نے سینہ کے قید خانہ میں انہیں بے دردی کے ساتھ مار ڈالا۔ جذبات کا لشکر بڑھا۔ وہ نہتی تھیں۔ کمزور تھیں۔ بیمار بھی تھیں۔ چرکے کھاتی رہیں۔ گھائل ہوتی رہیں۔ مگر اس لشکر کے سامنے بھی انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے اور بالآخر اس کو بھی کچل ڈالا۔ انہوں نے روند دیا۔ پامال کر دیا۔"

ثریا دم بخود۔ شاہد مبہوت۔ عزیز بیگم صم۔

منصور نے کہا۔

مجھے فخر تھا اپنی بغاوت پر۔ نادم اب بھی نہیں ہوں۔ لیکن رضیہ کی موت نے وہ فخر مجھ سے چھین لیا۔ میں نے تو ہر ہر مرحلہ پر شکست کھائی۔ دل کے سامنے سرنگوں جذبات کے روبرو دست بستہ اتنی شکستیں کھا کر اگر میں نے ایک سماج سے بغاوت کی اور جیت گیا۔ تو کیا جیتا۔ جیت وہ ہوتی ہے۔ جس کے آگے پیچھے کوئی ہار نہ ہو۔ اور یہ جیت صرف اس مرنے والی پر ختم ہو گئی۔

اب ثریا کی آنکھیں پرنم تھیں۔ منصور کہے جا رہا تھا۔

میرا جی چاہتا ہے۔ رضیہ کا ایک بڑا سا مقبرہ بنواؤں۔ چاہے میری ساری دولت اس کی تعمیر پر صرف ہو جائے۔ اور پھر اس کے صدر دروازہ پر سنگ مرمر کا ایک بڑا سا کتبہ نصب کراؤں جس پر لکھا ہو:۔

اس باغی کی قبر جس نے
دل سے بغاوت کی۔ اور
اس کے ٹکڑے کر دیئے!

زندگی میں پہلی مرتبہ آج منصور رو رہا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح!

دل

رئیس احمد جعفری کا وہ ناول جس پر
مصنّف کو خود ناز ہے!
عشقِ و محبّت کی ایک نفسیاتی کہانی!

قیمت چھ روپے

عورت

رئیس احمد جعفری کا مشہور ناول جس
میں عورت کی نفسیات پر ایسی بحث کی
گئی ہے۔ جسے پڑھ کر آپ متاثر ہوئے
بغیر نہیں رہ سکتے!

قیمت چار روپے آٹھ آنے

عورت

رئیس احمد جعفری کا مشہور ناول جس
میں عورت کی نفسیات پر ایسی بحث کی
گئی ہے۔ جسے پڑھ کر آپ متاثر ہوئے
بغیر نہیں رہ سکتے!

قیمت چار روپے آٹھ آنے

طوفان

رئیس احمد جعفری کا معرکہ آرا ناول جس
میں ایک ایسی حسینہ کی داستان بیان
کی گئی ہے۔ جس کا شوہر امرد پرستی پر
راغب تھا اپنی نوعیت کے اعتبار سے

لاجواب ناول!

قیمت تین روپیہ آٹھ آنے